نوکِ پلک
THE ART OF BEAUTY
(SHORT STORIES)
شکیل احمد چوہان

The Art of Beauty

(Short Stories)

مصنف

شکیل احمد چوہان

کتاب کا نام	....	نوک پلک (The Art of Beauty)
مصنف	....	شکیل احمد چوہان
اہتمام	....	علم و عرفان پبلشرز لاہور
کمپوزنگ	....	محمد سلیم
پروف ریڈنگ	....	خالد محی الدین
سرورق	....	طاہر محی الدین
سن اشاعت	....	اگست 2017ء
قیمت	....	-/300 روپے

......ملنے کے پتے......

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور

اشرف بک ایجنسی
اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

کتاب گھر
اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

خزینہ علم و ادب
الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

ویلکم بک پورٹ
اُردو بازار، کراچی

بیکن بکس
گلگشت کالونی، ملتان

رشید نیوز ایجنسی
اخبار مارکیٹ، اُردو بازار، کراچی

کشمیر بک ڈپو
تلہ گنگ روڈ، چکوال

فرید پبلشرز
اُردو بازار، کراچی

ادارہ کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہِ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

انتساب!

محترمہ آپا بانو قدسیہ کے نام
جن کی تھپکی نے میرے قلم کو اعتماد کی سیاہی بخشی
اللہ تبارک وتعالیٰ
اُنہیں کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے۔

(امین)

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
1	نوک پلک	7
2	پپو پائلٹ	28
3	داستانِ شکست	49
4	کنڈی نا کھولنا	62
5	تقریباً پونے گیارہ بجے	71
6	حرا کا حجاب	80
7	مائی چیمی کا فیصلہ	87
8	مولوی اسلامو کا کچا کوٹھا	95
9	دل کے قصے میں	102
10	مُنڈا اُفل شریف اَے	110
11	پانچ کا نوٹ	117
12	سوال	119

پیش لفظ

''نوک پلک'' میری تیسری کتاب ہے جو پرنٹ ہو کر آپ کے ہاتھوں کی زینت بنی ہے۔اِس سے پہلے میرا ناول ''بلال صاحب'' اور افسانوں کا مجموعہ ''زندگی کے بعد موت سے پہلے'' شائع ہو چکے ہیں، نئے لکھاریوں کے ساتھ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اُن کی کتابیں پڑھنے والوں تک پہنچ نہیں پاتیں ایسا ہی کچھ معاملہ میرے ساتھ بھی رہا ہے۔میرا ماننا ہے کہ آپ کے سب سے بڑے نقاد آپ کے پڑھنے والے ہی ہوتے ہیں۔لکھاری اپنے قارئین کی وجہ سے ہیں جن کی رائے سے لکھاری کو اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔

اس کتاب میں چھوٹی بڑی کل بارہ کہانیاں ہیں جن میں سے سات نئی ہیں پانچ افسانے میری پچھلی کتاب سے لیے گئے ہیں اُس کی وجہ یہ تھی کہ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا لکھاریوں کی تحریریں لوگوں تک پہنچ نہیں پاتیں اِن افسانوں میں کئی تلخ حقیقتیں بیان کی گئی ہیں میں یہ چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک یہ سچائی پہنچے۔

میں کہانی کے ساتھ تجربات کرنے کا قائل ہوں جن لوگوں نے میری پہلی کتابیں پڑھی ہیں وہ ضرور میری بات سے اتفاق کریں گے۔میری دوسری کتاب پہلی سے یکسر مختلف تھی اور یہ تیسری اُن دونوں سے الگ ہے۔میری دوسری اور تیسری کتاب میں تقریباً پونے دو سال کا وقفہ آیا، اِس کی وجہ یہ تھی کہ میں TV اور FILM کے کام میں مصروف تھا۔

اب کچھ ذکر اُن کا بھی جن کی وجہ سے میں ہوں۔والدِ گرامی جو اَب اِس دنیا میں نہیں ہیں اللہ تبارک تعالیٰ اُن کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور میری والدہ کو صحتِ کاملہ میسر آئے جس کے لیے میں دعا گو ہوں۔میری ''گرو'' آپا بانو قدسیہ اللہ تبارک وتعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائے۔میں سمجھتا ہوں کچھ دوستوں کا ذکر نہ کرنا نا انصافی ہوگی جیسا کہ محمد جمیل ملک، طارق حسین اور طاہر محی الدین اِن کی حوصلہ افزائی ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔

آخر میں گل فراز احمد صاحب کا شکر گزار ہوں جن کے ادارے علم و عرفان پبلشرز کی وجہ سے میری اِن کہانیوں کو کتاب کی شکل ملی۔

شکیل احمد چوہان

جولائی 2017ء

shakeelahmedchohan1@gmail.com

نوک پلک

''سوری ٹو سے.....اشیر تم نے اُس معصوم کے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی۔''

''میں نے زیادتی نہیں ظلم کیا تھا.....دانیال! بس ہو گیا گناہ مجھ سے اب کیا کروں.....؟ میں وہ سب بھولنا چاہتا ہوں، مگر تم مجھے بھولنے ہی نہیں دیتے.....تم کو فون اپنا دل ہلکا کرنے کے لیے کرتا ہوں..... پر تم ہمیشہ میرے زخموں پر نمک چھڑکتے ہو۔'' اشیر کے لہجے میں کرب تھا۔

''تم مجھے فون اپنے زخموں پر مرہم پٹی کروانے کے لیے ہرگز نہیں کرتے بلکہ تم وہ زخم خود ہرے رکھنا چاہتے ہو.....میں اُس کا ذکر نہ بھی کروں تو تم خود چھیڑ لیتے ہو.....بھول جاؤ اُسے اور وہیں کراچی میں کسی لڑکی سے شادی کرلو۔''

''شادی کیا کروں گا؟ میں ابھی تک وہ بھی نہیں کرسکا جس کے لیے اُسے چھوڑ گیا تھا۔'' اشیر مری ہوئی آواز میں بولا۔ سیکنڈ اسسٹنٹ ڈائریکٹر بھاگتا ہوا اشیر کے پاس آیا اور کہنے لگا:

''سر آپ کو نور سر بلا رہے ہیں.....''

''تم چلو میں آتا ہوں۔'' اشیر نے اسسٹنٹ کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

''دانیال! پھر بات کروں گا.....لنچ بریک ختم ہو گئی ہے۔'' اشیر نے فون بند کیا اور سامنے ٹیبل پر پڑا ہوا اپنا اسکرپٹ اُٹھایا اور فلم Director نور زیدی کی طرف چل پڑا۔ میک اپ آرٹسٹ ہنی اور فلم کی ہیروئن فضا تھوڑی دُور بیٹھی ہوئیں اشیر کو ہی دیکھ رہی تھیں۔

''گڈ لوکنگ ہے، مگر بجھا ہوا.....ٹو دی پوائنٹ بات کرتا ہے.....گوسپ وغیرہ بالکل نہیں۔''

''بے بی! گوسپ مجھ سے سنو.....میں نے پوچھا اشیر تم ہر وقت اُداس کیوں رہتے ہو.....کہنے لگا میری فیانسی مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔'' بات کرتے ہوئے ہنی کی باچھیں رقص کر رہی تھیں۔ فضا کی نظریں اشیر پر ہی ٹکی ہوئیں تھیں۔

''سنس آف ہیومر اچھا ہے اِس کا.....تم سے مذاق کیا ہوگا۔ کوئی لڑکی اِسے کیسے چھوڑ کر جاسکتی ہے۔''

☆......☆......☆

''مجھے چھوڑ کر چلا گیا.....؟'' سونیا نے پریشانی سے سوال پر سوال پوچھ لیا تھا۔ ایک لمحے کو تو اُسے اپنے کانوں کی سماعت پر بھروسا نہیں آیا ملازم نے ایک خط اُس کی طرف بڑھا دیا اور روکھی آواز میں کہنے لگا:

''سائیں نے کہا تھا.....خط بی بی کو دے دینا اور ناشتا وغیرہ کروا کر یہاں سے نکال دینا....'' سونیا نے ناشتے کی ٹرے کی طرف نظر ڈالی اور پھر ہاتھ میں پکڑے ہوئے خط کی طرف دیکھا۔ ملازم وہاں سے جا چکا تھا۔

سونیا نے خط کھول کر پڑھنا شروع کیا:

''تمھارے ساتھ گزارے ہوئے دو ہفتے میری زندگی کے یادگار دنوں میں سے ہیں.....دو راتوں کے بعد عورت میری نظروں سے اُتر جاتی ہے.....پہلی دفعہ میں نے کسی کے ساتھ دو ہفتے گزارے ہیں.....تمھارے تکیے کے نیچے اتنے پیسے ہیں کہ دو ہفتوں تک کسی ہوٹل میں آرام سے رہ سکتی ہو تم نے رحیم یار خان واپس جانا ہے.....یا کراچی میں رہنا ہے یہ فیصلہ تمھارا ہے۔ میری مانو تو کراچی میں ہی رُک جاؤ تمھارے جیسی بے شمار آوارہ لڑکیاں اِس شہر میں آتی ہیں.....اور پھر واپس کبھی نہیں جاتیں۔''

سونیا کی آنکھوں میں آنسو تھے اُس نے خط کو مسل کر پھاڑا اور غصے سے ایک طرف پھینکا۔

☆......☆......☆

''ریلکس بے بی! ریلکس بس ہو گیا نا.....بس فائنل ٹچ ہے۔'' میک اپ آرٹسٹ ہنی نے جھومتے ہوئے فضا کو تسلی دی جو بیٹھ کر تنگ آ چکی تھی۔

''میڈیم! اشیر صاحب کہہ رہے ہیں.....آپ کا ہی ویٹ ہو رہا ہے.....'' سیکنڈ اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے بڑے ادب سے پاس آ کر اطلاع دی تھی۔

''اشیر صاحب سے جا کر بولو.....ہنی میری نوک پلک ٹھیک کر رہا ہے.....'' فضا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اُس مسکراہٹ نے قہقہے کی شکل اختیار کر لی تھی اور قہقہے میں ہنی نے اُس کا پورا ساتھ دیا تھا۔

سونیا نے منہ میں کہا:

''نوک پلک؟'' سونیا وینٹی وین کے ساتھ کھڑی ساری باتیں سُن رہی تھی۔ فضا نے اشیر کے متعلق اپنی رائے دی:

''ہنی! پانچ سال ہو گئے انڈسٹری میں۔ ایسا ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر میں نے بھی نہیں دیکھا۔'' ہنی نے بھی آنکھوں کا جل ٹھیک کرتے ہوئے بتایا:

''اور میں نے ایسا مرد نہیں دیکھا.....اُس نے کبھی گندی نظر کسی ایکسٹرا آرٹسٹ پر بھی نہیں ڈالی، دسمبر میں اِس پروڈیوسر کی اگلی فلم امریکا میں شروع ہو رہی ہے اُس نے اشیر کو ڈائریکٹر سائن کیا ہے.....وہ فلم ہاتھ سے مت جانے دینا۔''

''آئی نو.....مگر کیسے؟ اشیر کو تو تم جانتے ہو.....وہ کام کے معاملے میں کسی کی نہیں سنتا.....میں نے اشیر کا اسکرپٹ پڑھا ہے..... بلیو می ہنی اگر وہ رول مجھے مل جائے تو.....وہ میری زندگی کا یادگار کردار ہو گا۔''

رومر ہے کسی نئی لڑکی کو کاسٹ کرے گا۔''

''اور میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔'' فضا نے اپنے ارادے ظاہر کیے۔

''لو بے بی تمھاری نوک پلک بھی ہوگئی....'' ہنی نے اپنی کمر کو بل دیتے ہوئے بڑے اسٹائل سے کہا۔

سونیا چلتی ہوئی ہنی اور فضا کے سامنے آ گئی۔

''Who Are You'' فضا نے سونیا کی خوبصورتی دیکھ کر حیرت سے پوچھا تھا۔ سونیا نے ایک بلوچی فراک پہنی ہوئی تھی بھوری آنکھوں میں رات کا کاجل تھا جو قدرے کم ہو چکا تھا۔ کالے سیاہ گیسوں کندھے سے ہوتے ہوئے ناف تک لٹک رہے تھے اور آدھے پچھلی طرف کمر تک بکھرے پڑے تھے۔

''Wow'' ہنی نے کھلے منہ کے ساتھ اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر صرف ایک لفظ بولا تھا۔

''میڈیم شاٹ ریڈی ہے اشیر سر بُلا رہے ہیں۔'' سیکنڈ AD پھر سے بھاگتا ہوا آیا تھا جب اُس کی نظر سونیا پر پڑی تو اُس نے جلدی سے پوچھا:

''تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''میں وہ.....اشیر.....'' سونیا نے پریشانی سے صرف اتنا ہی کہا تھا۔

''بے بی تم اشیر کی فیانسی ہو.....نا.....اُو مائی گاڈ یو آر سو بیوٹی فل.....''

فضا نے سونیا کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور وہاں سے چلی گئی۔ اسٹنٹ نے جاتے جاتے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے ہنی کو کہا:

''ہنی.....Mam کا خیال رکھنا.....میں شاٹ کے بعد اشیر سر کو بھیجتا ہوں۔''

''بڑا آیا سفارشی.....تم اِدھر آؤ بے بی۔'' ہنی نے جلدی سے بڑی نزاکت کے ساتھ سونیا کا ہاتھ پکڑا اور اُسے بڑے پیار سے بیوٹی چیئر پر بٹھالیا۔ سونیا کچھ گھبرائی ہوئی تھی ہنی کی میٹھی میٹھی باتوں سے فوراً ہی اُس کا اعتماد بحال ہو گیا بلکہ ایسا کہنا بہتر ہوگا کہ اُس کا اُوور کنفیڈینس واپس لوٹ آیا تھا۔

''بے بی! تم نے اشیر جیسے بندے کو چھوڑ کر کسی اور سے شادی کیوں کی.....؟ تمھیں اشیر کا ویٹ کرنا چاہیے تھا' ہنی نے گلے کے انداز میں پوچھا۔ سونیا کچھ سوچ میں پڑ گئی پھر ہنی ہی کے انداز میں بولی:

''اِس لیے تو مجھے طلاق ہوگئی۔'' سونیا نے مسکراتے ہوئے جھوٹ بولا۔

''اُو مائی گاڈ تمھیں ڈیورس ہوگئی.....اور تم اتنے Happy موڈ میں ہو۔''

''اشیر سے ملنے کی خوشی ہے.....'' سونیا نے آئینے میں خود کو دیکھ کر کہا۔

☆......☆......☆

"تم نے سارے یونٹ کے سامنے یہ کیوں کہا.....؟ کہ تم میری ایکس فیانسی ہو.....؟" اشیر نے اپنی گاڑی کے پاس پہنچ کر پوچھا ،اشیر کے لہجے میں غصہ تھا اِس کے باوجود سونیا شانت تھی اور ٹکٹکی باندھے اشیر کو دیکھے جا رہی تھی۔

"ایسے دیکھنا بند کرو! میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے.....؟"

"میری کہانی سنو گے.....؟"

"واٹ....." اشیر حیرت سے چلایا۔

"میرے ساتھ انگلش مت بولو..... مجھے انگلش نہیں آتی.....دوسری بات اِس وقت مجھے بہت سخت بھوک لگی ہے پہلے کچھ کھانا وانا کھلاؤ.....سوال جواب بعد میں کر لینا۔" سونیا نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"Are You Mad" اشیر دوبارہ سے چلایا۔

"انگلش نہیں.....اُردو میں ڈانٹو....." سونیا پر اشیر کے غصے کا رتی بھر اثر نہیں ہوا تھا۔

"میں تمھیں کھانا نہیں کھلا سکتا!"

"اگر تمھاری منگیتر کہتی تو اُسے بھی نہ کھلاتے.....؟"

اشیر یہ بات سُن کر سونیا کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ پہلے سے اشیر کو دیکھے جا رہی تھی جس کی آنکھوں میں شرارت اور ہونٹوں پر تبسم تھا۔

"بیٹھو گاڑی میں۔" اشیر نے سنجیدگی سے کہا۔

☆......☆......☆

ایک درمیانے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے کے بعد اشیر نے سونیا سے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا:

"تمھیں کہاں ڈراپ کروں....." سونیا نے جلدی سے اشیر کی طرف دیکھا۔

"مطلب تمھیں کہاں چھوڑ دوں.....؟"

"خیر اتنی بھی ان پڑھ نہیں ہوں.....آٹھویں پاس ہوں میں....." سونیا نے بڑے فخر سے بتایا۔ پھر آنکھوں سے تیر چلاتے ہوئے بولی:

"جہاں سمندر کنارے تم لوگوں کی فلم بن رہی تھی.....وہیں سامنے ہوٹل میں....."

"تم ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہو.....؟" اشیر نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"میں تمھیں بتانے لگی تھی.....تم نے کہا میں کھانا کھاتے ہوئے نہ فون سنتا ہوں اور نہ ہی باتیں کرتا ہوں میری کہانی سُن لو کام آئے گی.....ہنی بتا رہی تھی.....اِس فلم کے بعد.....تم اپنی فلم بناؤ گے۔"

''ھنی بتا رہا تھا۔'' اشیر نے سونیا کا صیغہ درست کیا۔

''تھی....ہنی جیسے عورتوں کے ساتھ خود کو زیادہ محفوظ سمجھتے ہیں۔''

''تو پھر تم میرے ساتھ اکیلی..... یہاں پر کیا کر رہی ہو۔'' اشیر تُرش لہجے میں بولا۔

''مردوں کو اچھی طرح سے جانتی ہوں.....تم ویسے نہیں ہو۔'' سونیا نے بڑے اعتماد سے اپنی بات کی۔

''کتنے مردوں کو جانتی ہو.....؟'' اشیر نے بغیر توقف کے پوچھا۔

''میں تو بہت سارے مردوں کو جانتی ہوں.....ویسے مرد ہوتے صرف دو قسموں کے ہیں۔'' سونیا بغیر کسی جھجک کے مردوں پر تبصرہ کر رہی تھی۔

''قسمیں.....؟'' اشیر نے ایک ہی لفظ بولا تھا سونیا پھر سے بول اُٹھی:

''اچھے اور کمینے.....تم اچھے مرد ہو.....! کمینے وہ ہوتے ہیں بھلے ہی چار شادیاں کر لیں عورتوں کو تاڑنے سے باز نہیں آتے.....اُن کی نظریں تیز تلوار کی دھار کی طرح ہوتی ہیں.....جیسے ہی عورت پر پڑتی ہیں عورت خود کو کٹتی ہوئی محسوس کرتی ہے.....ایسے کیا دیکھ رہے ہو.....؟ کار چلاؤ سمندر پر چل کے بیٹھتے ہیں۔''

سونیا کی بات سُن کر اشیر شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔ایک ذرا سے تامل کے بعد اشیر نے پوچھا:

''تمھیں ڈر نہیں لگتا.....؟''

سونیا نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے اشیر کو دیکھا اُس کے اُجلے ماتھے پر چند شکنیں نمودار ہوئیں وہ اضطراب سے بولی:

''میرے پاس ایسا کچھ نہیں ہے جس کے لٹ جانے کا ڈر ہو۔''

اشیر نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ڈرائیو کرنے لگا تھوڑی دیر بعد وہ دونوں سیمنٹ کی بنی ہوئی ایک سیٹ پر بیٹھے ہوئے چودھویں رات کی چاندنی میں نہاتے ہوئے سمندر کو دیکھ رہے تھے۔سیمنٹ کی ٹیک والی سیٹ کے ایک کونے پر اشیر بیٹھا ہوا تھا اور دوسرے کونے پر سونیا اُن دونوں کے سنٹر میں کوئی تیسرا آرام سے بیٹھ سکتا تھا۔

''میرے امی ابّو بچپن میں مر گئے تھے۔ہم دو بہنیں اور ایک ہمارا بھائی ہے.....میری بھابھی کا باپ میری بہن کا کھسم ہے.....'' اشیر یہ سُن کر ششدر رہ گیا۔

''سچ بول رہی ہوں.....ڈھکوسلا نہیں ہے.....'' سونیا کی ملائم آواز میں یک دم خرخراہٹ محسوس ہونے لگی۔

''بھائی میرا کباڑیہ ہے.....اُس نے خود جوان لڑکی سے شادی کرنے کے لیے.....بہن میری کو اُس بڈھے کھوسٹ کے کھونٹے سے باندھ دیا۔وٹے سٹے کی شادی تھی یہ.....بھابھی گھر میں آئی، تو اُسے میرا وجود کھٹکنے لگا.....اُس نے اپنی ایک سہیلی کے بیوٹی پارلر میں

مجھے کام پر لگوادیا۔اُس بیوٹی پارلر میں میری دُرانی کے ساتھ ملاقات ہوئی وہ مجھے کراچی لے آیا.....دُرانی ایک نمبر کا حرامی تھا.....شادی کا وعدہ کر کے لایا تھا.....مجھے لگا مجھے اُس حرامی سے عشق ہوگیا ہے۔ پندرہ دن میرے ساتھ عیش کرنے کے بعد.....اُس کی عیاشی میری عاشقی کو کھا گئی۔ایک دن پہلے ہی اِس ہوٹل میں آئی تھی۔آج صبح میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے تم لوگوں کو دیکھا۔میں سمجھی کوئی میلا لگا ہوا ہے۔جب میں آئی تو ہنی تمھاری ہیروئن کا میک اپ کر رہا تھا۔میں ویگن کے پیچھے کھڑی ہو کر باتیں سُننے لگی۔تھوڑی دیر بعد میں اُن کے سامنے آ گئی تو ہنی نے جلدی سے پوچھا تم اشیر کی فیانسی ہو.....میں نے بھی ہاں میں گردن ہلا دی۔“

سونیا بات کرتے ہوئے مسلسل اشیر کو دیکھے جا رہی تھی اُس کے برعکس اشیر مسلسل سمندر کی لہروں کو دیکھ رہا تھا مگر اُس کے کان ہمہ تن گوش تھے۔

”وہ بیوٹی پارلر نہیں.....حُسن کی منڈی تھا۔“

سونیا کے جملے نے اشیر کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔

”سمجھ گئے ہو.....یا سمجھاؤں.....؟“

”کیا سمجھا رہی ہو.....آدھی رات کو.....“ دو پولیس والوں میں سے ایک منہ میں پان چباتے ہوئے بولا، دوسرے نے سگریٹ چھوٹی انگلی میں لگایا ہوا تھا۔اُس نے اپنی مٹھی بند کر کے سگریٹ کا لمبا کش لگایا۔اشیر نے اپنی کمانڈو ٹائپ ویس کوٹ کی بڑی بڑی پاکٹیں ٹٹولیں اور جلدی سے ایک بڑے نیوز چینل کا کارڈ نکالتے ہوئے پولیس والوں کو دکھا کر بولا:

”میڈیا.....“ دونوں نے غور سے چینل کے کارڈ کو دیکھا۔سگریٹ والے نے جلدی سے اپنا سگریٹ سمندر کی ریت پر پھینک کر اُسے پاؤں سے مسل دیا اور بڑے مہذب لہجے کے ساتھ مشورہ دینے لگا:

”سر رات بہت ہوگئی ہے بھابھی جی کو لے کر گھر جائیں۔“

سونیا اور اشیر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور وہاں سے اُٹھ گئے۔

☆......☆......☆

”چار ماہ ہمیں ساتھ رہتے ہوئے ہو گئے.....بلڈنگ والے اور تمھارے دوست مجھے تمھاری منگیتر ہی سمجھتے ہیں.....لیکن میں آج تک تمھیں سمجھ نہیں پائی.....ہنی کے پارلر میں مجھ رکھوایا.....اب مجھے پارلر بنوا کر دے رہے ہو.....تم نے پارلر پر اتنے سارے پیسے بھی لگا دیے ہیں کیوں.....؟“ سونیا صوفے پر اشیر کے ساتھ چپک کر بیٹھی تھی اشیر نے حرکت کی اور آگے کو کھسک گیا۔سونیا اپنی شرارت پر خود ہی زیرِ لب مسکرائی.....اشیر نے اپنا لیپ ٹاپ بند کیا اور سامنے سینٹرل ٹیبل پر رکھ دیا۔

”چائے پیو گی.....؟ اشیر نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کچن کی طرف جاتے ہوئے کہا۔اُس نے سونیا کی بات سُنی اَن سُنی کر دی

تھی۔اشیر چائے بنانے میں مصروف ہوگیا۔سونیا جاکے اُس کی کمر سے لپٹ گئی۔اشیر نے اُسے بڑے تحمل سے خود سے الگ کیا اور کہنے لگا:

"نہ شرارت کیا کرو.....تمھیں پتا ہے یہ سب کچھ مجھے پسند نہیں ہے....."

"کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ تم بھی ہنی جیسے ہی ہو۔" سونیا نے بغیر لجا(شرم) کے بڑے آرام سے کہہ دیا۔

"شادی کروگی مجھ سے.....؟" اشیر کی آواز میں سچائی کے ساتھ ساتھ موسیقیت بھی تھی۔سونیا جیسی لڑکی بھی یہ سُن کر خاموش ہوگئی جیسے کسی نے اُس سے اُس کی قوت گویائی ہی چھین لی ہو۔

☆.....☆.....☆

"اشیر مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے....." سونیا نے ہنی کو بتایا ہنی یہ سُن کر عش عش کر اُٹھا۔

"رئیلی.....تم سچ کہہ رہی ہو بے بی....." ہنی نے سونیا کی بات کی تصدیق چاہی سونیا نے تائید کی گردن ہلا کر۔

"اومائی گاڈ.....سونیا!" ہنی ایسے خوش ہو رہا تھا جیسے سونیا نے تسخیر قمر کرلیا ہو۔

"مگر میں اُس سے شادی کیسے کرسکتی ہوں.....میں نے تمھیں اپنے بارے میں سب کچھ بتایا تو ہے....." سونیا کی آواز ڈبڈبا رہی تھی۔

"اشیر نے سب جانتے ہوئے تمھیں پرپوز کیا ہے۔" ہنی جلدی سے بولا۔سونیا نے اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے جھرجھری لی۔

☆.....☆.....☆

"یہ تمھارے پارلر کی چابی.....سائن بورڈ لگنے والا ہے اور کیڈلاک اور بروشر وغیرہ پرنٹ ہونے باقی ہیں.....تم نام ڈیسایڈ کر لیتی تو یہ کام بھی ہوچکے ہوتے پارلر کا کوئی نام سوچا ہے کہ نہیں.....؟"

اشیر نے صوفے پر سونیا سے کچھ فاصلے پر بیٹھتے ہوئے پارلر کی چابی سونیا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔سونیا نے اپنی خالی ہتھیلی آگے کی اشیر نے اُس پر چابی رکھ دی۔سونیا نے کہنا کچھ تھا اور اُس نے بول کچھ اور دیا:

"جہاں اتنا کچھ کیا ہے.....نام بھی خود ہی رکھ دو....."

سونیا گومگو کی کیفیت میں مبتلا تھی۔وہ اشیر سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ہمت نہیں تھی۔

"اشیر میں تمھارے قابل نہیں ہوں.....تم کسی اور سے شادی کرلو.....تم بڑے اچھے انسان ہو....." سونیا کی بات سُن کو اشیر کچھ سوچ میں پڑ گیا اُسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ سونیا کے انکار پر کیا کہے پھر اُس نے ہمت کر کے اپنے ماضی کے دریچے کھولے اور سونیا کو بتانے لگا:

"تم نے کہا تھا مرد اچھے ہوتے ہیں یا کمینے.....میں بھی ایک نمبر کا کمینہ ہو.....ہمیشہ خود کی خواہشوں کو اہمیت دی کبھی کسی کے بارے میں نہیں سوچا.....میں نے آج تک کراچی میں کسی کو اپنی حقیقت نہیں بتائی لیکن آج تمھیں بتا رہا ہوں.....میرا تعلق گوجرانوالہ سے ہے۔میں گدی نشین سید ہوں.....ہمارا گھرانہ بڑا مذہبی ہے۔میں گھر سے حفظ کرنے جاتا، مدرسے جانے کی بجائے سینما میں گھس جاتا تھا۔

قرآن تو میں نے حفظ کرلیا مگر میرا سینما کا شوق بڑھتا رہا۔تایا جی کی بیٹی سعدیہ سے میری بچپن ہی سے نسبت طے تھی۔لاہور سے میں نے میڈیا کمیونی کیشن میں ماسٹر کیا ہے۔کالج کم ایونیو، باری اور شباب، سٹوڈیو میں زیادہ پایا جاتا۔کالج کے دوران ہی دو تین فلمیں اسسٹ کر چکا تھا۔کالج ختم ہوا تو میں لاہور سے لوٹا۔سالوں بعد سعدیہ کو غور سے دیکھا۔وہ جوان ہو چکی تھی ہمارے گھر ساتھ ساتھ تھے۔تایا ابو سعدیہ اور نازیہ کی شادی اکٹھی کرنا چاہتے تھے نازیہ کا منگیتر جدہ میں ہوتا تھا اُس کی چھٹی کا مسئلہ تھا۔اِس لیے شادی میں چھ ماہ کی تاخیر ہوگئی۔

ایک دن تایا کے گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے میں تایا کے گھر چلا گیا۔سعدیہ گھر میں اکیلی تھی، میں نے اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے سعدیہ کو مجبور کیا۔اُس معصوم نے میری ضد کے آگے ہار مان لی۔جس کے نتیجے میں وہ حاملہ ہوگئی۔جب دونوں گھرانوں کو اِس بات کا علم ہوا، تو ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔تب تک تایا کو میرے اِس خفیہ شوق کی خبر بھی ہو چکی تھی۔

”تایا کہنے لگے.....سیدوں کا بیٹا اور شوق کنجروں والے.....فلم والوں کے ساتھ رہتے ہو۔اِس وجہ سے تم نے یہ بے غیرتی کی ہے۔“

تایا نے میرے سامنے فلم انڈسٹری چھوڑنے کی شرط رکھ دی۔اُس وقت تو میں خاموش رہا۔اگلے دن میرا سعدیہ سے نکاح تھا۔

اُسی رات ہماری فلم کے یونٹ کو تھائی لینڈ کے لیے روانہ ہونا تھا۔میں راتوں رات لاہور پہنچا اور تھائی لینڈ چلا گیا۔“ اشیر نے نظریں جھکائے ہوئے ایک ساتھ ساری باتیں سونیا کو بتائیں پھر خاموش ہوگیا۔تھوڑی دیر بعد اُٹھا اور کچن میں پانی پینے چلا گیا۔اشیر پانی کا گلاس اپنے ہونٹوں سے لگانے ہی لگا تھا سونیا نے جلدی سے اُس کی کلائی پکڑ لی پانی گلاس سے چھلک گیا تھا۔

”پھر سعدیہ کا کیا بنا.....؟“ سونیا نے سٹپٹاتے ہوئے پوچھا۔

”سعدیہ نے خودکشی کرلی تھی۔“ اشیر نے شکست وریخت سے بتایا اور سر پکڑ کر وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن صبح ہی صبح اشیر اپنے فلیٹ سے نکل گیا۔ہمیشہ کی طرح اپنی سنانے اور گھر والوں کی خیریت دریافت کرنے کے لیے اُس نے اپنے سب سے قریبی دوست دانیال کو گوجرانوالہ کال کی:

”کیا.....؟ تم نے اُس لڑکی کو پرپوز کر دیا.....جو پہلے کال گرل تھی پھر کسی کے ساتھ کراچی بھاگ آئی.....تمھارا دماغ تو ٹھیک ہے.....کیا پاگل ہوگئے ہو.....؟“ دانیال کی آواز میں تعجب کے ساتھ ساتھ غصہ بھی تھا۔

”اُس نے میرا پرپوزل ابھی ایکسپٹ نہیں کیا.....“ اشیر اُداسی سے بولا۔

”سیدوں کا لڑکا اب ایسی لڑکی سے شادی کرے گا.....؟“ دانیال کے لہجے میں طنزیہ نشتر تھے۔

”جو سیدوں کے لڑکے نے ایک معصوم کے ساتھ کیا وہ.....؟“ اشیر کے زخم پھر سے ہرے ہوگئے تھے۔

”آگ سے آگ نہیں بجھتی.....اشیر۔“

''جانتا ہوں.....اِسی لیے اپنے گناہوں کی آگ پر سونیا کی مجبوری کا میلا پانی ڈال کر اُسے بجھانا چاہتا ہوں.....دُعا کرو کہ وہ مان جائے۔''

اشیر کے منہ سے یہ سُنتے ہی دانیال نے قہقہہ لگایا اور ہنستے ہنستے کہنے لگا:

''دُعا.....؟ کس کو دعاؤں میں مانگ رہے ہو.....تمھارا اللہ ہی حافظ ہے۔'' دانیال نے فون بند کر دیا۔

''میں منافق ہوں اور وہ گناہگار۔

میں جھوٹا ہوں اور وہ سچی۔

میں نے دھوکا دیا ہے اور اُس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔

میرے ظاہر باطن میں فرق ہے اور اُس کا ظاہر باطن ایک ہی ہے۔

مین خواہش کا غلام ہوں اور وہ مجبوری کی باندی۔

تو پھر کیوں نہ اُسے دُعاؤں میں مانگوں۔''

اشیر بیٹھا ہوا خیالوں ہی خیالوں میں اپنا اور سونیا کا موازنہ کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

سارا دن باہر گزارنے کے بعد آدھی رات کو جب اشیر دبے پاؤں فلیٹ پر پہنچا اُس نے ہولے سے دروازہ کھولا تھا، وہ لاؤنج سے گزر کر اپنے روم میں جا رہا تھا۔ لاؤنج میں اندھیرا تھا۔

''شادی کے بعد.....میں تمھارے ماں باپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔''

رات کے سناٹے کو سونیا کی آواز نے توڑا وہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اشیر نے جلدی سے لاؤنج کی لائٹ جلائی۔

''کہاں تھے سارا دن، تمھارا موبائل بھی بند تھا.....میں نے کتنی بار تمھیں کال کی.....میں نے اور ہنی نے ہر جگہ تمھیں تلاش کیا۔''

سونیا اپنائیت سے اپنی دُھن میں بولے جا رہی تھی اور اشیر کی نظریں اُس کے مکھڑے پر جمی ہوئیں تھیں۔

وہ بُت بنا اپنی جگہ پر ساکن کھڑا تھا۔ سونیا اُس کے پاس گئی اور اشیر کی شرٹ کو بڑے پیار سے پکڑ کر کہنے لگی:

''میں بھی تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔'' سونیا نے اشیر کے گلے لگتے ہوئے اظہار محبت کیا۔ اشیر نے بڑے پیار سے سونیا کو خود سے الگ کرتے ہوئے کہا:

''ابھی ہمیں ایک دوسرے سے دور رہنا چاہیے.....میں دوبارہ وہی گناہ نہیں کرنا چاہتا۔'' یہ بول کر اشیر اپنی خوشی چھپاتے ہوئے اپنے روم میں چلا گیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن صبح ناشتے کی ٹیبل پر اشیر اور سونیا شرماتے ہوئے ایک دوسرے سے نظریں چُرا رہے تھے۔

''اگلے ہفتے میری فلم کا یونٹ امریکا چلا جائے گا۔ اِس دِن کا میں نے سالوں انتظار کیا ہے۔ فلم میکنگ میرا جنون ہے۔ میں تمھارا شوق بھی پورا کرنا چاہتا ہوں میری خواہش ہے کہ امریکا جانے سے پہلے تمھارے پارلر کی اوپننگ بھی ہو جائے۔''

''فلم میکنگ تمھارا جنون ہے.....اور پارلر بنانا میرا شوق تھا.....اِن جذبوں کے درمیان ہم دونوں کہاں ہیں۔'' سونیا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہم دونوں آمنے سامنے ہیں۔'' اشیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ہماری شادی کب ہوگی.....؟'' سونیا نے اشتیاق سے پوچھا۔

''شادی فلم کی ریلیز کے اگلے دن.....شادی کے بعد ہم کراچی ہی رہیں گے۔ وہ اِس لیے کہ امی بچپن میں فوت ہوگئی تھیں اور ابو دو سال پہلے..... پانچ بڑے بھائی ہیں جو اپنی اپنی زندگیوں میں خوش ہیں۔ دانیال سے اُن کی خیر خیریت پوچھتا رہتا ہوں۔ پانچوں میں صرف ایک ہی بات کامن ہے! وہ سب میری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے..... اِس لیے گوجرانوالہ جا نہیں سکتے۔'' اشیر نے اتنی تفصیل سے بتایا، سونیا کی طرف سے اگر، مگر، کیوں کا سوال ہی نہیں اُٹھا۔

''تم مجھے پارلر کا نام بتادو.....تاکہ میں آج ہی سائن بورڈ کے لیے کہہ دوں۔'' اشیر نے چائے کا سیپ لیتے ہوئے کہا۔

''سونیا بیوٹی پارلر.....'' سونیا نے سادگی سے کہہ دیا یہ سُن کر اشیر مسکرا اُٹھا اور سونیا کو محبت سے دیکھ کر بولا:

''تم آرٹسٹ بنو.....بیوٹیشن نہیں.....''

''میں سمجھی نہیں.....'' سونیا نے حیرانی سے پوچھا۔

''آرٹسٹ بیوٹیشن ہو سکتی ہے.....بیوٹیشن آرٹسٹ نہیں..... پارلر کا نام ایسا ہو جس میں پارلر کا تذکرہ نہ آئے.....کیونکہ پارلر تو بیوٹیشن چلاتی ہیں.....اور تم تو آرٹسٹ ہو۔''

''نام بھی تم ہی رکھ دو.....'' سونیا نے محبت کے ساتھ اشیر سے درخواست کی۔

''نوک پلک''

"The Art of Beauty"

اشیر نے پارلر کا نام تجویز کر دیا جو کہ سونیا کو بہت پسند آیا۔ دو دن بعد پارلر کا سائن بورڈ لگ گیا اور امریکا جانے سے ایک دن پہلے اشیر نے پارلر کی گرینڈ اوپننگ رکھی جس میں فلم اور TV کی مشہور ایکٹرسز نے شرکت کی۔ راتوں رات پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر ''نوک پلک The Art of Beauty'' کی دھوم مچ گئی۔ اگلے دن ڈیفنس اور کلفٹن کی ساری بیگمات نے ''نوک پلک'' کا رُخ کیا۔

سونیا کو ہنی کی چار ماہ کی ٹریننگ بڑی کام آئی۔ہنی نے اشیر کی سفارش پر سونیا کو کام سے لے کر ڈیلنگ تک سب کچھ سکھایا تھا۔ سونیا بہت خوش تھی اُس سے کہیں زیادہ اشیر خوش تھا کیونکہ اُس کا ایک خواب پورا ہوا تھا وہ ڈائریکٹر کی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔اشیر ہر روز امریکا سے سونیا کو فون کرتا۔کام کی مصروفیت کی وجہ سے اگر فون کرنے میں تھوڑی سی تاخیر ہو جاتی تو سونیا خود اشیر کو کال کر لیتی تھی۔ڈھائی ماہ اِسی طرح گزر گئے۔

☆......☆......☆

’’مسز پٹیل آپ ہر روز دلہن کی طرح کس کے لیے تیار ہوتی ہیں۔‘‘سونیا نے کنول خاور پٹیل کی نوک پلک سنوارتے ہوئے پوچھا۔کنول نے سونیا کی اسٹنٹ کی طرف دیکھا۔سونیا کنول کی آنکھ کا اشارہ سمجھ گئی۔

’’تم جاؤ.....‘‘سونیا نے اپنی اسٹنٹ کو باہر بھیج دیا۔

’’خاور پٹیل کے لیے تمہیں پتا تو ہے.....‘‘

’’اچھا اچھا.....‘‘سونیا نے کنول کے پیچھے کھڑے ہو کر شیشے میں کنول کو دیکھا دونوں کی نظریں ملیں۔

’’آج آپ بہت خوبصورت لگ رہی ہیں۔‘‘سونیا نے رسماً کہہ دیا۔

’’میری خوبصورتی میک اپ کی محتاج ہے.....اور تمھارا حُسن دیکھنے والے کو محتاج کر دے۔‘‘کنول نے سونیا کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا جس پر کچھ پریشانی تھی۔

’’پرسوں ہماری ویڈنگ اینی ورسری ہے ایک عالی شان پارٹی کا اہتمام کیا ہے۔پٹیل صاحب نے تم ضرور آنا۔‘‘

’’جی میں ضرور آؤں گی۔‘‘سونیا نے اُداسی سے کہا،کنول نے اُس کی اُداسی دیکھ کر پوچھا۔

’’خیریت تو ہے.....؟‘‘

’’جی مسز پٹیل خیریت ہی ہے.....‘‘

’’مجھے بتا سکتی ہو.....میں بھی تو ہر بات تم سے شیئر کر لیتی ہوں.....کم آن سونیا! ٹیل می.....کوئی پرابلم ہے تو مجھے بتاؤ.....‘‘

’’کل امریکا سے ہنی کی کال آئی تھی.....اُس نے بتایا کے اشیر اور فضا کی نزدیکیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔‘‘سونیا نے رُندھی ہوئی آواز میں خبر سُنائی۔

’’فضا وہ فلم ایکٹرس؟‘‘کنول نے فکر مندی سے پوچھا۔سونیا نے ہارے ہوئے جواری کی طرح گردن ہلا دی۔

’’تم تو کہتی تھی اشیر بڑا شریف آدمی ہے.....‘‘

’’میں تو اب بھی اشیر کو شریف آدمی ہی سمجھتی ہوں.....وہ تو فضا ہی ایسی ہے،پہلے فضا نے اِس فلم کے رول کے لیے ساری حدیں

پار کر دی تھیں اور اب اگلی فلم کے چکر میں پڑ گئی ہے.....وہ تو اللہ بھلا کرے ہنی کا جو ہر بات سے مجھے آگاہ کر دیتا ہے۔میں اِس لیے چاہتی تھی کہ امریکا جانے سے پہلے میرا اور اشیر کا نکاح ہو جائے۔'' سونیا کی آواز حسرت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''ڈونٹ وری! فضا.....اشیر سے شادی کبھی نہیں کرے گی۔'' کنول کی بات سُن کر سونیا نے حیرت سے کنول کو دیکھا تھا۔

''ہیروئن شادی کر لے تو وہ ہیروئن ہی نہیں رہتی.....وہ تو بیوی بن جاتی ہے۔شادی شدہ ہیروئن کی مارکیٹ ویلیو کم ہو جاتی ہے۔'' کنول کی بات سُن کر سونیا کو کچھ تسلی ہوئی تھی۔

''آنے دو اشیر کو میں بھی اِسی طرح رُلاؤں گی، جس طرح اُس نے مجھے رُلایا ہے۔'' سونیا نے ٹشو پیپر سے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کی۔

☆......☆......☆

تین ماہ بعد اشیر امریکا سے لوٹا وہ سونیا کو سرپرائز دینے کے لیے بغیر اطلاع کے آیا تھا۔ائیر پورٹ سے سیدھا وہ نوک پلک پہنچا۔

''سونیا کہاں ہے.....؟'' بے دھڑک اندر داخل ہوتے ہوئے اُس نے ریسپشنسٹ سے پہلا سوال یہی پوچھا۔

''میڈیم اپنے کیبن میں ہیں....'' ریسپشنسٹ نے پریشانی سے اطلاع دی۔اشیر جلدی سے سونیا کے کیبن کی طرف لپکا اُس نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک درمیانی عمر کی فربہ جسم کی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔

''آپ کون ہیں.....؟'' اشیر نے تشویشی انداز کے ساتھ پوچھا، وہ عورت یہ سن کر مسکراتے ہوئے کہنے لگی:

''مرجھایا ہوا کنول.....اشیر صاحب آپ تشریف رکھیں سب بتاتی ہوں۔'' اشیر بیٹھ گیا اور اردگرد دیکھ کر چپ نہ رہ سکا:

''سوری میں سمجھا نہیں....'' اشیر کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

''سمجھاتی ہوں.....کنول خاور پٹیل ہوا کرتی تھی میں.....اور اب صرف کنول ہوں۔''

''آپ کنول پھول جو بھی ہیں.....اُٹھیں یہاں سے یہ میری سونیا کی جگہ ہے.....کلائنٹ ہیں تو ویٹنگ ہال میں جا کر بیٹھیں۔''

''نوک پلک کی نئی مالکن میں ہوں.....حق مہر میں ملا ہے مجھے تمھارا نوک پلک.....تمھاری بھی ایک امانت ہے میرے پاس.....'' کنول نے اپنی ٹیبل کی دراز سے ایک چیک نکال کر اشیر کے سامنے رکھ دیا۔

''نوک پلک پر جتنا خرچہ آیا تھا.....اُس سے ڈبل پٹیل صاحب نے تمھیں واپس کر دیا ہے۔''

''یہ پٹیل کون ہے.....؟'' اشیر غصے سے چلایا اُتنی ہی مٹھاس سے کنول نے اُسے بتایا:

''سونیا کا ہسبنڈ'' کنول کے منہ سے نکلے ہوئے تین لفظ اشیر کے سینے میں ''نوک'' بن کر لگے۔اُس کی پلک نہیں پلکوں کے نیچے آنکھوں میں نمکین پانی سے جلن ہونے لگی۔وہ اپنے اشکوں کو گرنے سے پہلے چھپانا چاہتا تھا۔اِس لیے جلدی سے کرسی سے اُٹھا۔

''بیٹھ جاؤ اشیر! تم میرے سامنے آنسو نہیں گرانا چاہتے.....؟ ذرا میرے بارے میں سوچو میری دسویں ویڈنگ اپنی ورسری پر میرے ہسبنڈ نے مجھے ڈیورس جیسا گفٹ دیا تھا.....اور یہ گفٹ سونیا کی بدولت مجھے ملا ہے.....''اشیر کی آنکھوں میں چمکتے آنسو دیکھ کر کنول مسکرائی۔

''میں نے تو اُسے اپنا گرو مان لیا ہے.....یہ مسکراہٹ جو میرے چہرے پر دیکھ رہے ہو، یہ جیت کے بعد ہار کی ہے۔''

''کیسی ہار جیت.....''اشیر نے اپنی بھیگیں پلکیں صاف کیں۔

''خاور پٹیل کی پہلی بیوی کی ڈیتھ ہوگئی تو اُس نے اپنے بچوں کو لندن نانا نانی کے پاس بھیج دیا اور خود اپنی سیکرٹری سے دوسری شادی کر لی، اُن کی شادی کو چھ سات سال ہی گزرے تھے کہ مجھے خاور کے آفس میں اکاؤنٹنٹ کی جاب مل گئی۔ انہی دنوں خاور اور اُس کی وائف کے درمیان کوئی ٹینشن چل رہی تھی۔ خاور ایک وقت میں کئی عورتوں کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھتا ہے۔ جس کا فائدہ میں نے اُٹھایا اور خاور کی دوسری وائف کو ڈیورس دلوا کر خود خاور سے شادی کر لی.....میں کنول سے کنول خاور پٹیل بن گئی.....پر اندر سے رہی اکاؤنٹنٹ کی اکاؤنٹنٹ ہی میں 50، 60 لاکھ کے بینک بیلنس پر ہی خوش تھی.....مگر سونیا بزنس مین نکلی اُس نے منہ دکھائی میں ہی مرسڈیز اور کروڑوں کا بنگلہ لیا ہے.....شادی سے پہلے لاکھوں کی جیولری الگ سے.....شادی کے ایک ہفتے بعد ہی سونیا کے اکاؤنٹ میں کروڑوں روپیہ ہے۔''

''آپ جھوٹ بول رہی ہیں.....سونیا ایسی بالکل بھی نہیں ہے.....''

''تو پھر تم سونیا کو جانتے نہیں ہو.....میری بھی مت ماری گئی ہے.....سوال یہ ہے کہ اگر تم سونیا کو جان جاتے تو اِس حال کو نہ پہنچتے۔''اشیر کو ایسے لگا جیسے کنول اُس کا تمسخر اُڑا رہی ہے۔ اشیر کا دل کرچی کرچی ہو چکا تھا اس کے باوجود وہ دل کو تھپتھپا کر دلاسے دے رہا تھا۔ آخر کار اشیر ڈگمگاتی آواز میں بول اُٹھا:

''میں آپ کی باتوں پر کیوں یقین کروں۔''

''تمھیں یقین کرنا بھی نہیں چاہیے.....''کنول نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا۔

''سات بجے وہ آجائے گی تم خود دیکھ لینا.....''اشیر نے ٹائم دیکھنے کی غرض سے وال کلاک کی طرف دیکھا جس کے اوپر یکم اپریل کی ڈیٹ تھی۔ اشیر نے زوردار قہقہہ لگایا اور اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔

''آپ کی باتیں سُننے کے بعد میری تو جان ہی نکل گئی تھی.....سچ کہوں تو آپ نے مجھے رُلا دیا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ابھی پرسوں ہی میری سونیا سے فون پر تفصیل سے بات ہوئی تھی۔ آپ سونیا کی فرینڈ لگتی ہیں۔ آپ سے کیا پردہ، تین ماہ کے عرصے کے دُوران صرف کل میں نے سونیا سے بات نہیں کی.....اب میں سمجھ گیا ہوں.....آپ دونوں ڈراما کر رہی ہیں۔ آج یکم اپریل ہے.....آپ مجھے سونیا کے کہنے پر فول بنا رہی ہیں۔''

''بنا رہی ہوں.....؟اشیر صاحب محبت میں انسان ویسے بھی فول ہی بن جاتا ہے.....میں تو بزنس مین بھی اسٹوپڈ ہی نکلی.....''

''بزنس.....؟ ٹائٹل اچھا ہے.....مگر؟ کنول!!آپ کی اسٹوری میں بہت جمپ ہیں۔کہانی بھی بہت کمزور ہے۔اتنا بڑا بزنس مین اور تین عورتیں پلاننگ کر کے اُس سے شادی کر لیتی ہیں اور اُسے پتا بھی نہیں چلتا.....''اب اشیر کنول کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا جیسے کسی نئے رائٹر سے فلم کی کہانی سُن رہا ہو۔

''ہماری پلاننگ جہاں ختم ہوتی ہے.....خاور اُس سے آگے سوچنا شروع کرتا ہے.....اٹھاون کا ہو گیا ہے،خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر آج بھی اُس کی رال ٹپک جاتی ہے.....وہ حسن کو دیکھ کر اُس کی قیمت لگاتا ہے۔کسی کی قیمت چند گھنٹے ہوتے ہیں اور کوئی دس سال.....جس حُسن کو میک اپ کی ضرورت پڑنے لگے وہ اُسے چھوڑ دیتا ہے چاہے وہ کنول ہی کیوں نہ ہو.....مثال تمھارے سامنے بیٹھی ہے.....سُنا تو ہوگا کیچڑ میں کنول کھلتا.....وہ کیچڑ کو نہیں دیکھتا.....تازے کھلے ہوئے کنول کو دیکھتا ہے.....''

''اشیر مسلسل مسکرا رہا تھا جب سے اُسے پتا چلا کہ آج یکم اپریل ہے وہ کافی ریلکس ہو گیا تھا۔

''آپ بڑی اچھی ایکٹر ثابت ہو سکتی ہیں.....کیا عمدہ سین کیا ہے آپ نے.....اگلی فلم میں آپ کو ضرور چانس دوں گا..... پرامس.....''انٹر کام کی بیل نے اشیر کی باتوں کے سلسلے کو روکا.....کنول نے مسکراتے ہوئے ریسیور اُٹھایا۔

''سونیا خاور پٹیل آ چکی ہیں.....اور اشیر صاحب کو بلایا ہے۔''کنول نے ریسیور رکھ دیا۔

''جائیں اشیر صاحب میڈیم آ چکی ہیں.....آپ اُن سے مل سکتے ہیں۔''

☆......☆......☆

اشیر نے جلدی سے اپنے ہی آفس کا دروازہ کھولا.....سونیا نے پلٹ کر دیکھا۔اُس کا جھلملاتا ہوا رُخِ پُرنور سامنے تھا۔ہونٹوں پر تبسم آنکھوں میں شرارت.....وہ پہلے سے کہیں زیادہ شوخ اور چلبلی نظر آ رہی تھی۔اشیر خوابیدہ آنکھوں سے اُس تک رہا تھا۔وہ ہکا بکا تھا کیا یہ وہی سونیا ہے جسے تین ماہ پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔اشیر سونیا کے مکھڑے کی بھول بھلیوں سے نکلا تو اُس کی نظر سونیا کے گلے میں ڈائمنڈ کے نیکلس پر پڑی پھر کلائی کے کنگن پر اور دوسری کلائی سونے کی چوڑیوں سے بھری پڑی تھی۔

''ڈائمنڈ کے ساتھ گولڈ کون پہنتا ہے سونیا.....؟''اشیر نے بے تابی سے سونیا کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔سونیا نے بڑی نزاکت سے اشیر سے الگ ہوتے ہوئے جواب دیا:

''اشیر تم گناہ کر رہے ہو.....ہماری شادی نہیں ہوئی ہے.....تم ہی نے تو کہا تھا،ابھی ہمیں ایک دوسرے سے دُور رہنا چاہیے۔''

''بہت دُور دُور رہ لیا.....اب یہ دُوری برداشت نہیں ہوتی.....تم چلو میرے ساتھ ہم ابھی نکاح کرتے ہیں۔''اشیر نے سونیا کی کلائی پکڑتے ہوئے کہا۔سونیا نے اپنی کلائی اور اشیر کے ہاتھ کی طرف دیکھا پھر دلفریبی سے کلائی چھڑاتے ہوئے مسکرا کر بولی:

''مجھے تیار تو ہونے دو.....''

''اور کتنا تیار ہو گی تم.....؟ خود کو نظر لگاؤ گی کیا..... پہلے ہی کتنی حسین لگ رہی ہو.....کیا شاندار ڈریس پہنا ہے اوپر سے جیولری .....میک اپ کرنے کی بھی ضرورت نہیں.....'' اشیر نے الفت سے حقیقت بتائی۔

''اب جس کلاس سے میرا تعلق ہے.....وہاں میک اپ اُترنے ہی کب دیا جاتا ہے.....میک اپ کی ضرورت نہ بھی ہو تو ہم نوک پلک ضرور کرواتے ہیں.....''

سونیا سے ملنے کے بعد پہلی بار اشیر کے رُخسار پر تشویش نے ڈیرے ڈالے تھے۔

''کلاس.....؟'' اُس کی آواز میں حیرانی تھی۔

''بیٹھ جاؤ اشیر.....میں تمھارے لیے جوس منگواتی ہوں۔'' اشیر سونیا کی ستم ظریفی دیکھتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔سونیا نے انٹر کام کے ہوتے ہوئے بھی اپنے ہینڈ بیگ سے I Phone 7 نکالا اور بڑے اسٹائل سے کال ملائی۔

''دو فریش پائن ایپل جوس بھجوائیں.....''

فون بند کرنے کے بعد سونیا نے اشیر کے چہرے کو دیکھا جس پر تلخیاں آنا شروع ہو گئیں تھیں۔سونیا نے لب سکیڑ کر کہا:

''میں نے کنول سے کہا بھی تھا.....کہ تمھیں بتا دے.....اُس نے تمھیں کچھ نہیں بتایا.....؟''

''بتایا تو بہت کچھ ہے..... پر مجھے یقین نہیں آیا.....''

''کیا کیا بتایا ہے.....تاکہ میں اُس سے آگے کی کہانی سناؤں۔''

''خاور پٹیل کے بارے میں.....''

''وہ کیا بتائے گی خاور پٹیل کے بارے میں.....جو دس سالوں میں اُس مرد کی فطرت نہیں سمجھ سکی.....''

''کیا ہے اُس کی فطرت.....؟'' اشیر نے جانچتی نظروں سے پوچھا۔

''وہ پاس کی چیزوں کی قدر نہیں کرتا.....کنول نے یہی غلطی کی تھی.....سات دن میں وہ نظر بھر کے مجھے دیکھ نہیں سکا.....ابھی آجائے گا مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں.....میں اُس سے جتنی دُور رہوں گی وہ اتنا ہی مجھے دل کے پاس رکھے گا۔''

''کس لیے کیا تم نے یہ سب کچھ.....؟'' اشیر نے دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

''پیسے کے لیے.....اشیر! بے شمار پیسے کے لیے..... تمھیں فلم میکنگ کا جنون تھا.....اور مجھے بچپن سے امیر بننے کا.....جب میری بھابھی نے مجھے پارلر میں رکھوایا.....تو مجھے پتا چلا.....بھابھی کی سہیلی پہلے اُس مالک کے دوسرے پارلر میں بیوٹیشن کی نوکری کرتی تھی۔اُس نے پارلر کے مالک کو پھانسا اُس سے شادی کی اور اپنا خود کا پارلر بنوایا..... پر مجھے مِنی، پیڈی، فیشل، مساج یہ سب نہیں کرنا تھا۔رحیم یار خان

چھوٹا سا شہر ہے وہاں بڑے بڑے رئیس کہاں۔ میں خود شاہ زیب دُرانی کے ساتھ کراچی آئی تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ چند دن بعد مجھے چھوڑ دے گا۔ اُس نے ایسا ہی کیا، پھر میں تمھاری فلم کی شوٹنگ پر آئی ہنی فضا کا میک اپ کرتے ہوئے تمھارے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ اُسی وقت میں نے تمھیں سیڑھی بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ایک خیال اُس وقت میرے ذہن میں یہ بھی آیا کہ میں ہیروئن بن جاؤں پھر سوچا دفعہ کرو ہیروئنز تو دو 2 کوڑی کے مردوں کے سامنے ڈانس کر کر کے پاگل ہو جاتی ہیں۔ عورت حسین ہو پھر بھی مردوں کے آگے ناچے اِس سے بڑی حماقت کوئی ہو سکتی ہے کیا.....؟ اگر حُسن کی دولت لڑکی کے پاس ہو، پھر ناچنا نہیں نچایا جاتا ہے۔ جیسے پہلے تم اور اب خاور میرے اشاروں پر ناچ رہا ہے.....اب تم سوچ رہے ہو گے کہ میں نے خاور کو کیسے پھانسا ہے.....بتاتی ہوں.....نوک پلک کی اوپننگ کے بعد میری پہلی کلائنٹ ہی کنول تھی.....اُسے اپنی ڈھلتی عمر کی بڑی فکر تھی وہ ہر صورت میں خاور کے دل میں رہنا چاہتی تھی جیسے جیسے کنول کی عمر بڑھ رہی تھی وہ خاور کے نزدیک سے نزدیک تر ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے ڈھائی ماہ میں کنول سے ہر وہ بات معلوم کی جس کی مجھے ضرورت تھی پھر وہ دن آ گیا جب کنول نے اپنی شادی کی دسویں سالگرہ پر مجھے اپنے گھر بلایا تھا۔''

☆......☆......☆

سونیا بڑی ادا کے ساتھ خاور پٹیل کے سامنے سے گزرتے ہوئے محل نما گھر کے لاؤنج سے اوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔

''میں نے اوپر آتے ہوئے آپ کو دیکھا تھا..... پارٹی چھوڑ کر آپ یہاں اکیلی بیٹھی ہیں.....آپ کی تعریف.....'' خاور پٹیل نے سونیا کے سامنے بیٹھتے ہوئے بڑے مہذب انداز میں پوچھا۔

''سونیا.....نوک پلک The Art of Beauty کی اونر۔'' سونیا نے بڑے فخریہ انداز میں اپنا تعارف کروایا۔

''کنول کی بیوٹیشن ہیں.....Fine؟'' خاور نے منہ بناتے ہوئے کہا اور واپس جانے لگا۔ سونیا کے قہقہے نے اُس کے قدم روک لیے تھے۔

''بیوٹیشن نہیں.....آرٹسٹ.....آپ کے مرجھائے ہوئے کنول کی تازگی اِسی آرٹسٹ کے مرہونِ منت ہے۔''

''مرجھایا ہوا کنول.....انٹرسٹنگ.....ویری انٹرسٹنگ.....'' خاور نے سونیا کے سراپے کا سر تا پیر جائزہ لیا خاور کی سہولت کے لیے سونیا پہلے ہی اپنی جگہ سے اُٹھ گئی تھی۔

''بائی داوے.....بیوٹیشن اور آرٹسٹ میں کیا فرق ہے.....؟'' خاور نے کچھ کھٹے لہجے میں پوچھا۔ اُتنی ہی میٹھی مسکراہٹ سونیا کے ہونٹوں پر تھی۔

''پلیز ٹیل می.....'' خاور سونیا کا جواب سُننے کا مشتاق تھا۔

''پٹیل صاحب! دنیا گھومی ہے آپ نے.....میں آپ کو بتاتی ہوئی اچھی لگوں گی۔''

''میں آپ کی زبان سے سُننا چاہتا ہوں۔''

''بیوٹیشن آرٹسٹ کبھی نہیں ہوسکتی..... ہاں آرٹسٹ کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بیوٹیشن بھی ہو۔ آرٹس جوان کو بوڑھی اور بوڑھی کو جوان بنانے کا ہنر جانتی ہے..... اپنی بیگم کو ہی دیکھ لیں۔ کیسی ینگ لگ رہی ہیں آج..... یہ میرا ہی کمال ہے۔''

سونیا نے مسحور کن انداز میں نرم شگفتہ لہجے کے ساتھ اپنا پوائنٹ آف ویو خاور کے سامنے رکھا اور چل دی۔

'ویٹ..... ویٹ..... ویٹ.....'' خاور جلدی سے سونیا کے پیچھے لپکا تھا۔

''آپ میرے ساتھ کچھ وقت گزار سکتی ہیں..... قیمت جو آپ چاہیں.....'' خاور نے للچائی ہوئی نظروں سے سونیا کو دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ سونیا نے جان لیوا مسکراہٹ کے ساتھ خاور کی بڑھی ہوئی ہتھیلی کی طرف دیکھا۔

''چھوڑیں پٹیل صاحب! میں نے تو سُنا تھا آپ بہت بڑے بزنس مین ہیں..... آپ کو تو یہ بھی نہیں پتا انمول کی کوئی قیمت نہیں ہوتی..... دوسری بات میرا وقت میرے ہونے والے شوہر کی امانت ہے۔'' سونیا یہ بول کر پھر سے چل پڑی خاور کی آواز اُس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''وِل یو میری می.....'' سونیا کے قدم رُک گئے، اُس نے پلٹ کر دیکھا.....

''آپ واقعی انمول ہو..... میں گولڈ سمتھ کے بجائے بلیک سمتھ کی آنکھ سے آپ کو دیکھ رہا تھا۔''

''آپ اب بھی مجھے بلیک سمتھ کی آنکھ ہی سے دیکھ رہے ہیں..... میں کیوں کسی کی سیکنڈ وائف بن کے رہوں.....''

''پٹیل صاحب! سونیا آپ دونوں یہاں اوپر ہیں، میں نیچے پارٹی میں آپ دونوں کو دیکھ رہی تھی۔'' کنول کی آواز پر وہ دونوں چونکے کنول خاور کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔

''کنول! میں تمھیں طلاق دیتا ہوں۔'' خاور نے فاتحانہ نظر سونیا پر ڈالی اور اپنا ہاتھ سونیا کی طرف بڑھا دیا۔ سونیا نے مسکراتے ہوئے خاور کا ہاتھ تھام لیا اور اُس کے بازو میں بازو ڈال کر بڑی شان سے محبت کی بلندی سے دولت کی پستی کی طرف سیڑھیاں اُترنے لگی۔

نیچے جا کر خاور نے اپنی نئی ہونے والی بیوی کا اعلان سب مہمانوں کے سامنے کیا۔

ایک ہی لمحے میں کنول، خاور کی نظروں میں کنول سے کانٹا بن گئی تھی۔

☆......☆......☆

''تم میں رتی برابر بھی شرم نہیں ہے..... کیسی بے شرمی سے اپنی بے وفائی کا قصہ سنایا ہے مجھے.....'' اشیر نے بڑی حقارت سے سونیا کے ساتھ شکوہ کیا، اُتنے ہی فخر سے سونیا نے جواب شکوہ دیا۔

''شرم کی بات تمھارے منہ سے اچھی نہیں لگتی اشیر صاحب! میں نے تو صرف تمھارے جذبات کا خون کیا ہے..... تم نے پہلے

سعدیہ کی عزت کا جنازہ نکالا پھر اُسے خودکشی پر مجبور کردیا۔ تم نے میری ضرورت کے وقت مدد کی اُس کی قیمت کنول کے پاس چیک کی شکل میں موجود ہے جاتے ہوئے اُس سے لے لینا۔''

بس......! تم میری محبت کو مدد سمجھتی ہو....؟''

''کیسی محبت.....؟ ہم سب خواہشوں کے غلام ہیں اشیر صاحب! تمھاری خواہش میں نے کئی بار پوری کرنی چاہی، مگر تمھیں ہر بار گناہ یاد آجاتا تھا۔''

''تم تو مجھے اچھا مرد کہا کرتی تھی۔''

''تم ابھی اچھے نہیں ہو.....صرف اچھا بننے کی کوشش کررہے ہو.....تمھاری کوشش تب تک کامیاب نہیں ہوسکتی.....جب تک سعدیہ تمھیں معاف نہیں کردیتی.....کبھی سعدیہ کی قبر پر جاکے اُس سے معافی مانگنا.....اگر اُس نے معاف کردیا پھر تم اچھا بن سکتے ہو.....'' سونیا کا کرارہ جواب سُن کر اشیر نے نظریں جھکالیں۔ کچھ توقف کے بعد سونیا نے دوبارہ بولنا شروع کیا:

''اشیر! ہر انسان کے نزدیک کچھ لفظوں کے اپنے مطلب ہوتے ہیں جیسے (اچھا بُرا).....اور وہ مطلبوں ہی سے مطمئن ہوجاتا ہے چاہے اُس میں حقیقت ہو یا نہ ہو۔ میں نے ایک بار ہنی سے پوچھا.....یہ نوک پلک کا کیا مطلب ہے تو اُس نے مجھے مسکراتے ہوئے بتایا تھا کہ جب اشیر نے میک اپ کو فائنل ٹچ دلوانا ہوتو وہ کہہ دیتا ہے.....ہنی اِس کی نوک پلک کرکے جلدی سے بھیج دو.....میرے نزدیک نوک پلک کا اپنا مطلب ہے۔ میں مرد کو نوک اور عورت کو پلک سمجھتی ہوں.....اچھے مرد اُس نوک سے بہو بیٹیوں کی حفاظت کرتے ہیں اور کمینے مرد اُسی نوک سے عورتوں کو زخمی کرتے ہیں۔ عورتیں پلک کی طرح نازک ہوتی ہیں۔''

''آج تو بڑی فلاسفر بن رہی ہو.....'' اشیر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''دھکے انسان کو فلاسفر بنا دیتے ہیں۔ دوسری بات میں پڑھی لکھی ہوں.....فلسفہ بول سکتی ہوں۔'' سونیا نے اشیر سے نظریں ملاتے ہوئے کہا اشیر یہ سُن کر بھی چونکا تھا۔

''میں نے اُردو میں ماسٹر کیا ہے.....وہ الگ بات ہے اوپن یونیورسٹی سے کیا ہے.....''

''کیا فائدہ تمھاری تعلیم کا؟ پڑھ لکھ کے بھی دھوکا ہی دیا ہے!''

''اشیر! تم پرسنل ہورہے ہو....'' سونیا نے انگلی دکھاتے ہوئے اشیر سے کہا، دونوں نے سنجیدگی سے چند لمحے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا۔ پھر سونیا مسکرا اُٹھی جیسے اشیر پر ترس آگیا ہو اور فاتحانہ تبسم سے کہنے لگی:

''خیر کوئی بات نہیں دوست ہو.....ذرا بتاؤ.....؟ میں نے کیا دھوکا دیا ہے تمھیں۔''

''تم نے شادی کا وعدہ کیا تھا۔'' اشیر نے اپنی طرف سے سونیا کو لاجواب کیا۔

’’میں نے وعدہ کیا تھا، تم نے وعدہ کر کے دھوکا دیا ہے۔ میری تمھاری شادی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ کہ ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لیے۔ اب جیسا خاور پٹیل ویسی ہی سونیا خاور پٹیل.....‘‘ سونیا نے خود کو ملامتی انداز کے ساتھ مخاطب کیا۔ اشیر کو سونیا کا ایک اور روپ نظر آیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر خاموش ہو گیا۔ پھر دل میں آیا ہوا سوال زبان پر لے ہی آیا۔

’’تم خود عورتوں کی کون سی قسم سے ہو، کبھی خود کو بھی جاننے کی کوشش کی ہے؟‘‘ سونیا یہ سُن کر کھلا کھلا کر ہنسی اور کافی دیر ہنستی رہی۔ پھر ہنستے ہنستے ہی بولی:

’’پلک کے بال گن سکتے ہو.....؟‘‘

’’کیا.....؟‘‘ اشیر کا لہجہ سوالیہ تھا۔

’’جتنے عورت کی پلک میں بال ہیں بلکہ دونوں پلکوں کے..... نہیں نہیں..... اُس سے بھی کہیں زیادہ عورتوں کی قسمیں ہیں..... مگر انہیں زبان صرف ایک ہی سمجھ آتی ہے.....‘‘

’’وہ کون سی.....؟‘‘ اشیر نے تجسس سے پوچھا۔

’’محبت کی..... صرف اور صرف محبت کی..... سعدیہ بے حیا نہیں تھی..... وہ بیچاری تو تمھاری ہوس ہی کو محبت سمجھ بیٹھی تھی..... اُس کی قبر پر جا کے آنسو گراؤ گے تو تم دونوں کی روحوں کو سکون مل جائے گا۔ جاؤ گے نا.....؟ سعدیہ کی قبر پر؟‘‘ اشیر کی آنکھیں یک دم تلابوں کی طرح بھر گئیں۔ تھوڑی دیر بعد اُن سے بے ساختہ اشک گرنا شروع ہو گئے۔ سونیا کچھ دیر تو دیکھتی رہی پھر اُس نے اشیر کا موڈ بہتر کرنے کے لیے جلدی سے بات بدلی۔

’’رونے دھونے کی ضرورت نہیں..... پٹیل جلد ہی مرنے والا ہے۔ اُس کے مرنے کے بعد میں تم سے بھی شادی کرلوں گی۔‘‘

اشیر روتے روتے فٹ سے ہنس پڑا اور اپنی پلکوں کو صاف کرتے ہوئے کہنے لگا:

’’سونیا! ایک نمبر کی کمینی ہو تم..... واقعی تم عورتوں کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔‘‘

’’سچ کہہ رہی ہوں..... خاور پٹیل کو دو ہارٹ اٹیک ہو چکے ہیں..... تیسرے میں ضرور لگا جائے گا۔‘‘ سونیا مسکراتے ہوئے بولی۔

دروازے پر دستک ہوئی سونیا نے اشیر کو نارمل ہونے کا اشارہ کیا۔

’’یس.....‘‘ ایک ڈیسنٹ سا ہینڈسم آدمی اندر آیا۔

’’پٹیل صاحب! یہ میرے دوست اشیر ہیں..... میں نے آپ کو اِن کے بارے میں بتایا تھا۔‘‘

’’اچھا تو آپ ہیں اشیر..... آپ کی شرافت کی ہماری وائف قسمیں اُٹھاتی ہیں..... آپ کی وجہ سے ہمارا ہنی مون 5 دن لیٹ ہوا ہے..... اِن کی ضد تھی آپ سے ملے بغیر یہ یورپ نہیں جائیں گی۔‘‘

''نائس ٹو میٹ یو اشیر!'' خاور پٹیل نے اشیر سے ہاتھ ملایا۔

''سیم ہیئر'' اشیر نے مصنوعی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

''چلیں ڈارلنگ.....'' خاور پٹیل نے اپنا بازو آگے بڑھایا۔

''چلیں.....'' سونیا نے مسکراتے ہوئے بازو کے اندر بازو ڈالا اور وہ دونوں آفس سے نکلنے لگے، تو سونیا نے گردن موڑ کر اشیر کو آنکھ ماری۔

''کمینی نہ ہو تو.....'' اشیر نے مسکراتے ہوئے منہ میں کہا۔

☆.....☆.....☆

اشیر تھوڑی دیر بعد نوک پلک کی بلڈنگ سے باہر نکلا اور ایک نمبر ملایا۔

''آ گئے امریکا سے.....؟'' دانیال نے پوچھا۔

''تمھیں سعدیہ کی قبر کا پتا ہے.....'' اشیر نے جواب دینے کے بجائے اپنا سوال پوچھا۔

''سعدیہ کی قبر.....؟ ہاں پتا ہے۔''

''میں آج آ رہا ہوں.....''

''تایا جی اور تیرے بھائی تجھے قتل کر دیں گے۔'' دانیال نے فکرمندی سے کہا۔

''اُنھیں کون بتائے گا.....میں سعدیہ کی قبر پر جاؤں گا اور پھر کراچی واپس.....اگر تو نے کسی کو بھی میرے آنے کی اطلاع دی تو میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔'' اشیر نے یہ کہہ کر جلدی سے فون بند کر دیا۔ وہ معافی مانگنے سے پہلے ہی خود کو ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا اور اپنی گاڑی کی طرف چل دیا۔ وہ اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر اُس میں بیٹھے ہی لگا تھا ایک آواز نے اُس کا تعاقب کیا۔

''سر! آپ کا چیک.....کنول میڈم نے دیا ہے۔'' سیکورٹی گارڈ تھا۔

اشیر نے مسکراہٹ کے ساتھ وہ چیک تھام لیا پھر کچھ سوچا۔

''ہیلو! بات سنو.....'' اشیر نے جاتے ہوئے سیکورٹی گارڈ کو آواز دی۔ وہ بھاگتا ہوا واپس آیا۔

''جی سر!''

''مجھے جانتے ہو.....؟''

''سر آپ نے ہی تو مجھے نوکری پر رکھا تھا۔'' گارڈ نے ادب سے جواب دیا۔

''یہ چیک لو.....اور اِسے کیش کروا کے نوک پلک کے سارے اسٹاف میں برابر تقسیم کر دینا۔''

”سر میرا ابھی اِس میں حصہ ہے.....؟“ گارڈ نے شرماتے ہوئے پوچھا۔

”سب کا برابر حصہ ہے.....“ اشیر نے اچھے موڈ سے کہا۔

”سر! اللہ آپ کو خوش رکھے۔“ گارڈ دعائیں دیتے ہوئے چلا گیا۔

اشیر اپنی گاڑی میں بیٹھنے کے بجائے اُس سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی نظریں نوک پلک کے سائن بورڈ پر تھیں اُس کے ہونٹوں سے یہ الفاظ نکلے:

”نوک پلک The Art of Beauty“

پپو پائلٹ

نادیہ کو King Edward Medical College میں داخلہ ملا، تو شازیہ کو یہ فکر ستانے لگی کہ اب وہ کالج کیسے جایا کرے گی۔ ہمیشہ کی طرح اِس مسئلے کا حل بھی باؤ حمید نے ہی نکالا جو نثار احمد کا بچپن کا دوست تھا۔ باؤ حمید کیٹرنگ کا کاروبار کرتا تھا جب سے نثار احمد دبئی گیا، اُس کے سارے معاملات باؤ حمید ہی دیکھتا تھا۔ شازیہ کو وہ بھابھی کی بجائے باجی کہتا، سعود، داؤد اور نادیہ..... شازیہ اور نثار کے تینوں بچے بھی اُسے ماموں ہی کہتے۔

"نادیہ جلدی سے ناشتا کرلو کالج سے دیر ہو جائے گی۔" شازیہ نے کچن سے آواز لگائی۔

"ممّی دیر تو ہو ہی جائے گی ماموں حمید کا رکشے والا، ابھی تک جو نہیں آیا۔" گھر کی بیل بجی۔

داؤد باہر دیکھو.....! شازیہ نے پھر کچن سے آواز دی۔

"ماما میں ناشتا کر رہا ہوں۔" داؤد نے فٹ سے کہہ دیا۔

"میں بھی ناشتا کر رہا ہوں۔" سعود نے بھی جلدی سے اپنی مصروفیت بتا دی۔

نادیہ نے سعود اور داؤد کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں معصوم اسکول یونیفارم میں ملبوس بول تو سچ ہی رہے تھے۔ دوبارہ ڈور بیل ہوئی ۔نادیہ نے شیشے میں ایک بار پھر سے اپنا میک اپ چیک کیا۔

"کون ہے صبح صبح.....؟" نادیہ بے زاری سے بولی۔

"رکشے والا ہوگا.....؟" شازیہ چائے والی ٹرے اُٹھائے نادیہ کے پاس سے گزری۔

"مجھے ہی دیکھنا پڑے گا۔" شازیہ نے چائے کی ٹرے ڈائننگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ممّی میں دیکھتی ہوں۔ یہ دونوں تو ایک نمبر کے کام چور ہیں۔" نادیہ نے ہال سے باہر جاتے ہوئے داؤد اور سعود کو گھوری ڈالی۔

"کون ہو تم اور کس سے ملنا ہے.....؟" نادیہ نے بیرونی گیٹ کھولتے ہی تلخی سے پوچھا۔

"پپو پائلٹ....." لڑکے نے بڑے اسٹائل سے جواب دیا۔ اُس کا دوسرا جملہ منہ میں ہی تھا۔

"یہ ائیر پورٹ نہیں نادیہ نثار کا گھر ہے۔" نادیہ نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ کر زور سے گیٹ بند کر دیا۔

گیٹ اتنی زور سے مارا گیا تھا کہ اُس کی دھمک ہال تک آئی۔

''نادیہ کے ہاتھوں صبح صبح کس کی شامت آئی ہے۔'' شازیہ کو فکر لاحق ہوئی۔

''ممی مانگنے والا ہوگا۔'' داؤد نے اندازہ لگایا۔ نادیہ ہال میں واپس لوٹی۔ سعود نے نادیہ کو دیکھتے ہی کہا:

''ہو ہی نہیں سکتا..... جب سے اُس لنگڑے فقیر کی نادیہ آپی نے وپیر سے دھلائی کی ہے۔ کوئی بھی فقیر اب صبح صبح ہمارے گھر کی بیل نہیں بجاتا۔''

''لنگڑا کدھر سے تھا وہ..... جب میں نے اُس کی ٹانگوں پر وپیر مارے کیسے گھوڑے کی طرح بھاگا تھا۔'' نادیہ کے موبائل پر بیل ہوئی، نادیہ نے موبائل اسکرین دیکھتے ہوئے کہا: ''ماموں حمید کی کال'' پھر موبائل کے سینے پر اپنی اُنگلی سے گدگدی کی۔

''ماموں جی آپ کا رکشے والا تو ابھی تک نہیں آیا؟ کالج کے پہلے دن ہی میں لیٹ ہو جاؤں گی، آپ نے تو کہا تھا وہ ٹائم پر پہنچ جائے گا۔'' نادیہ نے بولتے بولتے سانس لی تو باؤ حمید کی باری آئی:

''پپو پائلٹ رکشے والا ہی ہے۔'' باؤ حمید نے اطلاع دی اور کال کاٹ دی۔

''وہ نمونہ رکشے والا ہے.....؟'' نادیہ نے حیرت سے کہا۔

''ناشتا میں نے پیک کر دیا ہے کالج میں کھا لینا..... یہ تمھارا بیگ، اب چلو شاباش.....'' شازیہ باہر تک نادیہ کو چھوڑنے آئی۔ پپو اپنے رکشے کے سامنے کالا چشمہ لگائے بڑے اسٹائل سے کھڑا تھا۔ شازیہ نے پپو کو اوپر سے لے کر نیچے تک دیکھا جیسے کچھ یاد آ گیا ہو پھر مسکرائی، نادیہ کو رکشے میں بٹھایا، رکشا کیا تھا تین ٹائروں والی دوڑتی بھاگتی دلہن ہی تھی۔ نادیہ نے رکشے میں بیٹھنے کے بعد اُسے اندر سے غور سے دیکھا پھر پپو پر نظر ڈالی۔ وہ پائلٹ نہیں تھا مگر اسٹائلش ضرور تھا۔ رکشا چل پڑا۔ شازیہ رکشے کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی، رکشے کی بیک پر لکھا تھا۔ ''پپو پائلٹ'' رکشا گلی کا موڑ مڑا تو شازیہ گیٹ سے اندر آئی۔

''یہ لیں باجی جی! آپ کے ٹائم سے 5 منٹ پہلے ہی آپ کو پہنچا دیا۔'' پپو نے کالج کے سامنے بریک لگاتے ہوئے کہا، پپو نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی رکشے کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ نادیہ باہر نکل آئی اور پپو کے سامنے کھڑے ہو کر کہنے لگی:

''سارے رستے تم مجھے باجی باجی کہتے آئے ہو..... تم سے بہت چھوٹی ہوں..... میں۔''

''باجی جی! وہ تو آپ ہیں..... میں بائیس سال کا ہوں۔ آپ زیادہ بھی ہوئیں تو ستارہ، اٹھارہ سال کی ہوں گی۔''

''سترہ پورے نہیں ہوئے ابھی..... تم سے پورے پانچ سال چھوٹی..... ٹھیک دو بجے پہنچ جانا.....'' نادیہ نے کالج کے گیٹ کی طرف پلٹتے ہوئے پانچ انگلیوں کا پنجہ دکھا کر ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''باجی جی! آپ مجھ سے عمر میں چھوٹی ہیں مگر عزت میں بہت بڑی ہیں۔'' پپو نے رکشا گیئر میں ڈالتے ہوئے کہا۔ نادیہ نے یہ سُنا تو پلٹ کر دیکھا۔ پپو رکشا موڑ رہا تھا جس کے پیچھے لکھا ہوا تھا۔ ''پپو پائلٹ''

دو بجنے سے پانچ منٹ پہلے ہی پپو کالج کے باہر پہنچ گیا وہ رکشے سے اُترا اور کپڑا لے کر رکشے کی اندر باہر سے صفائی میں لگ گیا۔

نادیہ کالج سے باہر آئی تو..... اپنے پورے جلوؤں کے ساتھ چمکتا ہوا رکشا تو کھڑا تھا مگر پپو نہیں تھا۔ نادیہ نے ارد گرد دیکھا برگد کے نیچے پان والے کھوکھے سے پپو پان خرید رہا تھا۔ ایک پان اُس نے منہ میں ڈالا کوئی چار پانچ پیک کروائے اور بھاگتا ہوا رکشے کے پاس آیا۔

''باجی جی! میں تو پانچ منٹ پہلے ہی آ گیا تھا۔''

''Ok.......چلو.....'' نادیہ نے رکشے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''باجی جی! پان کھائیں گی.....؟'' پپو نے رکشے کے سینٹر والے مِرر میں نادیہ کو دیکھ کر پوچھا۔

''Thanks......'' نادیہ نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ پپو مزے سے پان کھا رہا تھا۔ جیسے ہی رکشا کنال روڑ پر آیا۔ نادیہ نے پپو سے پوچھا:

''تم نے اپنے رکشے کے پیچھے پپو پائلٹ کیوں لکھوایا ہوا ہے.....؟''

پپو نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا:

''باجی جی! بچپن میں میرا ابّا مجھے پپو کہتا تھا۔ میں بڑا گول مٹول جو ہوا کرتا تھا۔ امّاں کو ابّا کے پپو کہنے پر بڑا غصہ آتا تھا۔ امّاں مجھے عرفان پائلٹ کہا کرتی تھی۔ امّاں مجھے پائلٹ بنانا چاہتی تھی۔ میں پڑھائی میں اچھا بھی تھا۔ آٹھویں میں تھا ابّا کا رکشا چلاتے ہوئے ایکسیڈنٹ ہو گیا وہ موقعے پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ میری دو چھوٹی بہنیں ہیں میں بڑا تھا۔ اسکول چھوڑا اور رکشے کی سیٹ پر بیٹھ گیا تب سے رکشا چلا رہا ہوں۔''

''رکشا اپنا ہے.....؟'' نادیہ نے رکشے کی سجاوٹ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی جی اپنا ہے..... اِس کے علاوہ تین اور ہیں.....'' پپو نے بڑے مان سے کہا۔

''وہ بھی اِسی طرح کے ہیں.....؟''

''رکشے تو اچھی حالتوں میں ہیں..... مگر سجاوٹ ایسی نہیں۔''

''پھر تم نے اس رکشے کے اوپر اتنی فضول خرچی کیوں کی ہوئی ہے۔''

''باجی جی! شوق کو فضول خرچی نہیں کہتے۔''

''یہ کیسا شوق ہے.....؟'' نادیہ کو پپو کا یہ شوق بیوقوفی لگا، وہ زیرِ لب مسکرائی۔

''ابّا کہا کرتا تھا..... گڈی اور بڈی ایسی ہو کہ پاس کھڑے ہوئے وہ تمھاری مالکی اور تم اُس کے مالک لگو..... باجی جی آپ کا گھر آ گیا.....'' پپو نے رکشے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

نادیہ اپنا اگلا سوال منہ میں لیے ہی رکشے سے اُتر گئی۔

نادیہ کو گھر کی بیل دینی ہی نہیں پڑی شازیہ جیسے اُسی کے انتظار میں کھڑی تھی۔شازیہ نے جلدی سے گیٹ کھولا نادیہ اندر آ گئی۔

"ممّی جی!اسلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام....."سلام کے جواب کے بعد شازیہ نے گردن گیٹ سے نکال کر دیکھا۔پپو گیٹ کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔شازیہ اور پپو نے مسکراہٹ کے ساتھ ایک دوسرے سے سلام دُعا کی۔

نادیہ واش روم سے فریش ہو کر نکلی تو ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگ چکا تھا۔

"آپ کے جڑواں نظر نہیں آ رہے۔"نادیہ نے کُرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اکیڈمی گئے ہیں....."

"دبئی کی ساری کمائی اِن پر ہی لگا دیں۔"

"بھائی ہیں تمھارے....."شازیہ نے بھائی پر زور دے کر کہا۔

"پتا ہے بھائی ہیں میرے.....ڈیڈی اور آپ کی آنکھوں کے تارے میری تو اِس گھر میں کوئی اہمیت ہی نہیں۔"نادیہ نے سنجیدگی سے شازیہ کو دیکھ کر کہا۔شازیہ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"نادیہ تمھیں کیوں ایسا لگتا ہے.....چلو بریانی تو ڈالو.....میں نے بھی کھانا نہیں کھایا....."

"آپ دونوں کے رویوں کی وجہ سے.....یہ بریانی بھی سعود کی فرمائش پر ہی بنی ہو گی۔"

"تمھاری فرمائش پر بھی تو بناتی ہوں۔"

"مجھ سے کہیں زیادہ آپ کو اپنے یہ دو جڑواں بچے پیارے ہیں۔"

"چھے سال دن رات اِن کے لیے دُعائیں مانگی تھیں۔اگر یہ پیدا نہ ہوتے تو تمھاری دادی نے مجھے گھر سے 9 دو 11 کر دینا تھا۔"

"مگر ڈیڈی تو ہمیشہ آپ سے کہتے ہیں ہم دل دے چکے صنم....."

"ارے چھوڑو اپنے ڈیڈی کی.....تمھارے ڈیڈی تو دوسری کو گھر میں لانے کے لیے ریڈی بیٹھے تھے۔"

"ممّی جی!تُسی گریٹ ہو.....جو ایسے صنم بے وفا ہسبنڈ اور دبنگ ساس کے ساتھ گزارا کیا۔۔۔میں سونے جا رہی ہوں۔"نادیہ نے چاولوں کی آخری بائٹ لی اور کُرسی سے اُٹھ کر ہال میں سے اوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کر دیا۔

"تم بھی اپنی دادی کی طرح دبنگ ہی ہو،مگر تمھارے پاپا صنم بے وفا ہرگز نہیں....."شازیہ نے کچھ یاد کرتے ہوئے نادیہ کو اوپر جاتے دیکھا جب نادیہ نظروں سے اُوجھل ہو گئی تو شازیہ نے ٹھنڈی سانس بھری اور زیرِ لب مسکراتے ہوئے خیالوں میں کھو گئی۔

"کن خیالوں میں کھوئی ہوئی ہے.....؟ میری مجاجن۔" پپو نے چھالا کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"انارکلی سے تمھارے لیے پان لایا ہوں....." پپو نے پان والا شاپر بیگ دکھاتے ہوئے اطلاع دی۔

"وہ بوہڑ (برگد) والے کھوکھے سے.....؟" چھالا نے لوہے کی بڑی ٹیک والی کرسی سے اُچھلتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ساڈے دل دے مالکوں۔"

"پپو! میرے سامنے شان بننے کی کوشش مت کیا کرو.....کاٹ کے رکھ دوں گی....." چھالا نے لکھنو کی کسی بیگم کی طرح بڑی ادا سے پان منہ میں ڈالتے ہوئے وارننگ دی۔

"ہائے ہائے میری قطرینہ.....تیرا غصہ بھی مجھے پیارا ہی لگتا ہے۔" پپو نے چھالا کے ہاتھ کا بوسہ لیتے ہوئے اپنی محبت کا اظہار کیا۔

"چھوڑو.....کوئی آ جائے گا.....ساری کاریگر چھت پر کھانا کھا رہی ہیں۔" چھالا نے جلدی سے شرماتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"ویسے سلّو نے قطرینہ کو چھوڑ دیا ہے۔!" چھالا نے اپنی ایک ابرو کو بڑے انداز سے اُٹھاتے ہوئے بتایا۔

"جب تم اُسے پیار سے سلّو کہتی ہو، تو میرے دل کو ہاتھ پڑتا ہے.....تم دیکھ لینا.....رنڈوا ہی مرے گا.....ان شاءاللہ۔" پپو نے چڑتے ہوئے جواب دیا۔

"رنڈوے مروتم....." چھالا نے ادائے بے نیازی سے کہہ دیا۔ پپو نے جلدی سے چھالا کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ چھالا کی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھیں کھلی ہوئیں تھیں۔ پپو کی گہری سیاہ آنکھوں میں غصہ تھا۔ وہ دونوں اتنے قریب تھے کہ چھالا اور پپو کے ہونٹوں کے درمیان صرف پپو کا ہاتھ تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں کھو گئے تھے۔ چھالا کی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ آنکھوں میں سے چند اشک ٹپکے جنھوں نے پپو کے دل کی دھرتی کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پپو نے ہولے سے اپنا ہاتھ چھالا کے ہونٹوں سے ہٹا لیا اور سیدھا کھڑا ہو کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ چھالا جذباتی انداز میں پوری شدت کے ساتھ پپو کی کمر سے لپٹ گئی۔

"سوری پپو! منہ سے نکل گیا تھا۔ مریں تمھارے دشمن، میرے منہ میں خاک" چھالا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"معاف کر دو.....نا.....اگر تم نے مجھے معاف نہیں کیا؟ تو میں خود کو کاٹ کے رکھ دوں گی۔" آواز میں محبت کا درد تھا۔

"مرنے سے ڈر نہیں لگتا میڈم! کنوارہ مرنے سے لگتا ہے۔" پپو نے مڑتے ہوئے چھالا کو خود سے الگ کیا۔ پپو کا ڈائیلاگ سُن کر چھالا کھِل اُٹھی، جو اُس کے سامنے ہی کھڑی تھی۔

"میں تمھارے ساتھ جینا چاہتا ہوں، زندگی گزارنا چاہتا ہوں.....جب ہم دونوں بوڑھے ہو جائیں گے تو تمھارے مرنے کے اگلے دِن ہی میں تمھاری جُدائی کی وجہ سے خود بہ خود مر جاؤں گا۔"

''مجھے بھی اپنے پپو سے پیار، محبت، عشق سب کچھ ہے۔ سلّو کو تو صرف پسند کرتی ہوں۔ تمھارے لیے جان دے بھی سکتی ہوں اور کسی کی لے بھی سکتی ہوں۔'' چھالا نے پپو کی آنکھوں میں دیکھ کر جذباتی ہو کر اپنے دل کا حال سنایا۔۔ پپو نے چھالا کا جذباتی انداز دیکھ کر خود ہی بات بدل دی اور ہال کے اندر لگے ہوئے سلمان خان کے بڑے سے پوسٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''تمھاری پسند کی وجہ سے اُس کی طرح کے کپڑے مجھے پہننے پڑتے ہیں۔''

''اور سینے ہمیں پڑتے ہیں۔'' ہال کے ایک کونے سے چند آوازیں ایک ساتھ بُلند ہوئیں۔ پپو اور چھالا نے چونک کر دیکھا چھالا کی کاریگر عورتیں اور لڑکیاں کھانا کھا کر آ چکی تھیں۔

''تم سب کب آئیں.....؟'' چھالا نے نظریں چراتے ہوئے پوچھا۔

''اُجالا باجی! جب تم نے کہا تھا۔۔۔ رنڈوے تم مرو.....'' ایک لڑکی نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''چلو سب اپنی اپنی مشینوں پر بیٹھ جاؤ..... پرسوں تک عالیہ E کا آرڈر پورا کرنا ہے۔'' چھالا نے جلدی سے بات بدلی، پھر اپنے ٹیبل کی دراز کھولی اور اُس میں سے روپے اور ایک لسٹ نکال کر پپو کو تھماتے ہوئے کہا:

''کل پرسوں جب بھی شاہ عالمی کی کوئی سواری ملے یہ سامان لیتے آنا۔'' چھالا نے پپو سے ایسے کہا جیسے وہ اُسے جانتی ہی نہ ہو۔ اُس کی سب کاریگر اپنی اپنی سلائی مشینوں پر بیٹھنے کے باوجود کن انکھیوں سے اُن دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔

''اب تو ہر روز ہی اُس طرف جانا ہوگا۔''

''کیوں.....؟'' چھالا نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''پکی سواری لگ گئی ہے۔''

''کس جگہ کی.....؟'' چھالا جلدی سے بولی۔

''اُسی کالج کی.....!'' پپو نے کالج کو لمبا کھینچا تھا۔

''وہ اُستانی واپس آ گئی ہے.....؟''

''اُستانی نہیں پروفیسر صاحبہ تھیں۔'' پپو نے ماتھا پکڑتے ہوئے سمجھایا۔

''ایک ہی بات ہے..... اُستانی بھی پڑھاتی ہے اور پروفیسر بھی پڑھاتی ہے۔''

''خود کو فیشن ڈیزائنر کہلواتی ہو۔ کوئی درزن کہے تو کیسے بھڑک جاتی ہو..... میری درزن.....'' پپو یہ بولتے ہی وہاں سے بھاگا چھالا نے درزن سُنتے ہی ٹیبل پر پڑی ہوئی دھاگے والی کون پپو کو پیچھے سے ماری اور پھر بڑے رومینٹک انداز میں منہ ہی میں بولی: ''کاٹ کے رکھ دوں گی۔''

''تھپڑ ماروں گی.....!'' نادیہ نے غصے سے سعود کو آنکھیں دکھائیں۔

''نادیہ! کبھی پیار سے بھی بات کر لیا کرو۔'' شازیہ نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''پیار وہ بھی نادیہ آپی.....؟ یہ تو ہر وقت ہمیں مارتی ہی رہتی ہیں۔'' داؤد سلائس منہ میں ڈالتے ہوئے بھولے پن سے بولا۔

اتنے میں ڈور بیل بج اُٹھی۔

''رکشے والا آ گیا.....تمھارا ناشتا نہیں ہوا۔'' شازیہ نے فکرمندی سے کہا۔

''یہ پانچ منٹ پہلے ہی آ گیا ہے۔'' نادیہ نے وال کلاک کی طرف دیکھ کر ہلکی سی خفگی سے کہا۔

نادیہ کالج کے لیے نکلی ہمیشہ کی طرح شازیہ اپنی بیٹی کو بیرونی گیٹ تک چھوڑنے گئی۔ پپو گیٹ کے سامنے اپنے رکشے میں ریڈی پوزیشن میں بیٹھا تھا۔ کھلتے گیٹ کی آواز پر پپو نے گیٹ کی طرف دیکھا، نادیہ گیٹ کے اندر سے برآمد ہوئی شازیہ نے پپو کو آج پھر غور سے دیکھا۔ آج پپو نے چشمہ لگانے کے بجائے اپنی کالر کے پیچھے لٹکایا ہوا تھا۔ نادیہ کے لیے پپو نے رکشے کا دروازہ کھولا شازیہ نے مسکراتے ہوئے پپو کو دیکھا۔ پپو نے بھی مسکراہٹ سے جواب دیا اور رکشا چلا دیا۔ نادیہ آدھے رستے چپ رہی اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی، پھر اُس کی نظر کالر کے پیچھے لٹکتے ہوئے چشمے پر پڑی نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے پپو سے پوچھ ہی لیا:

''تم بھی سلمان خان کے فین ہو.....؟''

''نہیں باجی جی!''

''شاہ رخ کے ہو.....؟''

''نہیں شاہ رخ کا بھی نہیں.....'' پپو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''تو پھر عامر خان کے ہو گے۔'' نادیہ نے جلدی سے پوچھا۔ جیسے وہ ہو۔

''باجی جی میں Bollywood کے کسی خان کا فین نہیں ہوں۔ میں تو اپنے شان کا فین ہوں۔''

''شان.....؟'' نادیہ نے شان بڑا عجیب سا منہ بنا کر کہا تھا۔

''مجاجن میں نے پتا نہیں کتنی بار دیکھی ہے۔''

''مجاجن.....یہ کون ہے.....؟'' نادیہ نے حیرت سے پوچھا۔ پپو نے زور سے قہقہہ لگایا پھر کہنے لگا:

''باجی جی! شان اور صائمہ کی بڑی ہٹ فلم کا نام مجاجن ہے۔''

''میں نے تو شان کی صرف ایک Movie وار ہی دیکھی ہے.....تم نے دیکھی ہے.....؟''

''کیوں نئیں جی..... پہلے دن پہلا شو.....'' پپو نے بڑے فخر سے بتایا۔

''وہ تو انگلش میں ہے.....''

''یہی تو میں چھالا کو سمجھاتا ہوں.....کہ اپنا شان پنجابی کے ساتھ ساتھ انگلش فلموں کا بھی ہیرو ہے۔''

''کس کو سمجھاتے ہو.....؟'' نادیہ نے الجھے لہجے میں پوچھا۔

''باجی جی کالج آ گیا....'' پپو نے بریک لگاتے ہوئے کہا ساتھ ہی رکشے کا دروازہ بھی کھول دیا۔ نادیہ نیچے اُتر گئی۔ وہ پپو سے کچھ کہنے والی تھی کہ پپو بول پڑا:

''باجی جی! پانچ منٹ پہلے پہنچ جاؤں گا۔'' نادیہ یہ سُن کر کالج کے اندر چلی گئی۔ پپو وہاں سے شاہ عالم ہول سیل مارکیٹ چلا گیا۔

نادیہ کالج سے باہر نکلی تو پپو رکشا اسٹارٹ کیے تیار کھڑا تھا۔ پپو نے عادت کے مطابق بیٹھے بیٹھے ہی دروازہ کھولا نادیہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ رکشا چل پڑا۔

''Stop...Stop'' نادیہ نے جلدی سے کہا۔

''کیا ہوا.....؟ باجی جی۔''

''یہ بڑا سا شاپر بیگ کوئی سواری بھول گئی ہے۔'' پپو نے سینٹر مرر میں نادیہ اور بڑے سے شاپر بیگ کو دیکھا جو نادیہ کے پہلو میں سیٹ پر پڑا تھا۔

''یہ سامان کسی سواری کا نہیں میری چھالا کا ہے.....'' پپو نے اطمینان سے اطلاع دی۔

''چھالا کا.....؟ اب یہ چھالا کون ہے.....'' نادیہ نے ناک چڑھاتے ہوئے پوچھا۔ چھالا سُن کر پپو کا چہرہ قندھاری انار کی طرح لال ہو گیا۔

''باجی جی! چھالا میری سگی خالہ کی بیٹی ہے اور منگیتر بھی۔'' پپو نے شرماتے ہوئے بتایا۔

''تم لوگوں کے کوئی ڈھنگ کے نام نہیں ہوتے.....پپو چھالا۔'' نادیہ نے عجیب حقارت سے کہا۔

''باجی جی! میں نے کل آپ کو بتایا تو تھا میرا اصل نام عرفان ہے اور چھالا کا صحیح نام اُجالا ہے، وہ تو صرف میں پیار سے چھالا کہتا ہوں اگر اور کوئی کہے تو چھالا قینچی سے اُس کی زبان کاٹ دے۔''

''اس شاپر میں ہے کیا.....؟'' نادیہ نے شاپر بیگ کی طرف دیکھ کر جاننا چاہا۔

''سلائی کا میٹریل ہے.....نلکیاں، بٹن، بکرم، لیس اور پتا نہیں کیا کیا.....مجھے تو نام بھی نہیں آتے.....''

''وہ اتنے زیادہ میٹریل کا کیا کرے گی.....؟''

''اُس کا سلائی والا کارخانہ ہے.....سات مرلے کے ہال کے اندر اُس نے بڑی بڑی سلائی مشینیں لگا رکھی ہیں۔''

"کہاں ہے یہ کارخانہ.....؟"

"گھر کی تیسری منزل پر....." پاس سے ایک کار تیز ہارن بجاتے ہوئے گزری۔

"کیا کہا تم نے.....؟ ٹریفک کا اتنا شور ہوتا ہے کچھ سنائی ہی نہیں دیتا۔"

"باجی جی! چائے پئیں گی؟"

"چائے.....کیا مطلب ہے تمھارا....." نادیہ کی آواز اور لہجہ یک دم بدل گیا۔ پپو نے نادیہ کے لہجے کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔

"وہ سامنے بالتّے چائے والی کی دُکان ہے....." پپو نے رکشا روکتے ہوئے انگلی سے اشارہ کیا ایک لڑکا جلدی سے اُن کے پاس آ گیا۔

"ایک دودھ پتی ملائی کے ساتھ..... باجی جی! آپ نے بتایا نہیں....." اِس سے پہلے کہ نادیہ کوئی فیصلہ کرتی پپو پھر سے بول اُٹھا:

"دو دودھ پتی ملائی کے ساتھ..... یہ جو گاڑیوں کا شوروم ہے..... یہاں پہلے سینما ہوا کرتا تھا۔ اِن چائے والوں کے دادا کا چھوٹا سا کھوکھا تھا سینما کے اندر.....اور آج پتا نہیں کتنے من دودھ آتا ہے اِس چائے کی دُکان پر..... پورے لاہور سے لوگ یہاں چائے پینے آتے ہیں.....کل میں بڑی مشکل سے یہاں سے گزرا تھا چائے پیے بغیر....."

پپو نان سٹاپ بولے جا رہا تھا۔ نادیہ پپو کے یک طرفہ فیصلے پر خائف تھی وہ ابھی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ لڑکا چائے لے کر آ گیا۔ پپو نے پہلے چائے نادیہ کو پیش کی پھر خود پرچ میں ڈال کر شڑ شڑ پینے لگا۔ نادیہ غصے سے بھری پڑی تھی اُس نے غصے میں چائے کا ایک سیپ لے لیا پھر دوسرا پھر تیسرا اُسے چائے بہت ٹیسٹی لگی۔ نادیہ نے بھی جلدی سے چائے ختم کر دی اور اپنے بیگ سے سو کا نوٹ نکال لیا۔ پپو نے چائے والے کو رکشے میں بیٹھے بیٹھے ہی اشارہ کیا وہ جلدی سے کپ لینے آ گیا پپو نے اُسے ساٹھ روپے دیے۔

"چائے کے پیسے میں دوں گی۔" نادیہ جلدی سے بولی۔

"کمال کرتی ہیں باجی جی! آپ کیوں دیں گی.....شہزادے تجھے پیسے مل گئے ہیں، تو نکل۔" پپو نے چائے والے لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ وہ لڑکا چلا گیا پپو نے بھی رکشا اسٹارٹ کیا اور محمود غزنوی روڈ کی طرف چل پڑا۔

"پپو یہ پیسے رکھ لو۔" نادیہ نے سو کا نوٹ بازو لمبا کرتے ہوئے پپو کے دائیں کندھے کے پاس کیا۔

"نا کرو باجی جی.....! عارفہ اور آصفہ میرے ساتھ ہوتیں تو کیا میں اُن سے پیسے لیتا۔"

"عارفہ اور آصفہ کون.....؟"

"میری چھوٹی بہنیں ہیں جی....."

"وہ بھی سلائی کرتی ہیں.....؟"

"نئی جی! وہ دونوں تو گیارہویں بارہویں میں پڑتی ہیں۔"

''اُنہیں کون کالج چھوڑنے جاتا ہے۔''

''کالج کی بس آتی ہے گھر کے پاس۔''

''کون سے کالج میں پڑتی ہیں.....؟''

''نام تو پتا نہیں جی! وہ شوکت خانم ہسپتال کے سامنے لال سی بلڈنگ ہے جس کے اوپر بڑی سی گھڑی بھی لگی ہوئی ہے.....وہاں پڑتی ہیں۔''

''پنجاب کالج۔'' نادیہ نے جلدی سے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''پتا نہیں سندھ ہے کہ پنجاب ہے۔'' پپو نے سڑک پر نظریں جمائے ہی بغیر کسی تاثر کے کہہ دیا۔

''وہ تو پرائیویٹ کالج ہے اور مہنگا بھی۔''

''کیا کہا آپ نے.....؟'' ٹریفک کے شور کی وجہ سے پپو کو نادیہ کی بات سنائی نہیں دی۔

''سرکاری کالجوں کے مقابلے میں وہ تو مہنگا ہے.....'' نادیہ نے چلاتے ہوئے بتایا۔

''اللہ کا شکر ہے باجی جی ہم بھی کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ چار اپنی گڈیاں چلتی ہیں.....چھے دکانوں کا کرایہ آتا ہے۔ 10 مرلے کا ذاتی گھر ہے.....!'' پپو نے اپنی کالر کو پکڑ کر بڑے اسٹائل سے جواب دیا۔

''رہتے کہاں ہو تم.....؟'' نادیہ نے تجسس سے پوچھا۔

''بیڑ پنڈ میں'' پپو نے بڑے فخر سے بتایا۔

''اور تمھاری چھالا.....؟''

''شادے وال پنڈ میں۔''

''اچھا اچھا گاؤں میں رہتے ہو تم دونوں.....'' نادیہ نے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''لاہور سے کتنی دُور ہیں یہ دُونوں گاؤں.....؟'' پپو نے قہقہہ لگاتے ہوئے بریک لگائی اور باؤ حمید کی طرف دیکھ کر کہنے لگا:

''باجی جی! وہ آپ کو باؤ حمید صاحب بتائیں گے۔'' باؤ حمید نادیہ کے گھر کے سامنے کھڑا تھا وہ گھر کی بیل بجانے ہی لگا تھا کہ نادیہ اُس کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔

''السلام علیکم ماموں جی۔''

''وعلیکم السلام کیسی ہے ماموں کی جان۔'' سر پر پیار دیتے ہوئے باؤ حمید محبت سے بولا۔

''ٹھیک ہوں.....!''

"پپو رکشا تو زیادہ تیز نہیں چلاتا.....؟" باؤ حمید نے پپو کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں نادیہ سے پوچھا تھا۔ نادیہ نے جواب دینے کے بجائے گھر کی بیل بجادی۔

"باؤ جی آپ کا حکم تھا.....پھر بھی پوچھ لیں۔" پپو یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا شازیہ نے بھی گیٹ کھول دیا۔ کھانا کھاتے ہوئے باؤ حمید نے مسکراتے ہوئے بتایا:

"بیڑ اور شادے وال جوہر ٹاؤن کے اندر دو گاؤں ہیں۔"

"واپڈا ٹاؤن میں ہمارا صرف پانچ مرلے کا گھر ہے اور یہ رکشے والا دس مرلے کے گھر میں رہتا ہے۔" نادیہ نے حیرانی سے کہا۔

"نادیہ بیٹا دیہات کے گھر بڑے ہی ہوتے ہیں۔"

"آپ تو کہہ رہے تھے کہ جوہر ٹاؤن میں ہیں یہ گاؤں۔"

"بیٹا یہ گاؤں پاکستان بننے سے بھی پہلے کے آباد ہیں۔ اس سارے علاقے کو آباد ہوئے تو 20 پچیس سال ہی ہوئے ہیں۔" باؤ حمید نے نادیہ کی اُلجھن دُور کرنے کی پوری کوشش کی۔

"اچھا باجی میں چلتا ہوں۔" باؤ حمید وہاں سے چلا گیا۔

رات کو جب شازیہ دوسری منزل پر نادیہ کے کمرے میں دودھ لے کر گئی تو نادیہ پڑھ رہی تھی۔

"نادیہ دودھ پی لو.....کل بھی تم سے پوچھا تھا کہ یہ رکشے والا کیسا ہے.....؟" شازیہ کرسی لے کر نادیہ کے ساتھ بیٹھ گئی اور دودھ کا مگ رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"ٹھیک ہے....." نادیہ نے بغیر کسی تاثر کے کہہ دیا۔ اُس کی نظریں کتاب پر ہی رہیں۔

"میں نے حمید بھائی سے کہا بھی تھا کوئی بزرگ آدمی ہو مگر انہوں نے اس کو بھیج دیا۔" شازیہ فکرمندی سے بولی۔

"میں نے کہا نا ٹھیک ہے.....آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ آپ بس اپنے داؤد مسعود کی فکر کیا کریں!" شازیہ نے پیار سے نادیہ کو تھپکی مارتے ہوئے کہا:

"دُکھی آتما.....ہر وقت بھائیوں سے حسد کرتی رہتی ہو۔"

"کل اُس نے باڈی گارڈ میں جو سلمان نے شرٹ پہنی تھی ویسی پہن رکھی تھی اور آج دبنگ کی طرح نظر آ رہا تھا۔"

"دُعا کریں شرٹ پہنے رکھے کسی دن یہ بھی اُس چھچھورے خان کی طرح بغیر شرٹ کے ہی نہ آ جائے۔"

"سلمان کا فین لگتا ہے۔" شازیہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی۔

"سلمان کا نہیں.....شان کا فین ہے۔" نادیہ نے دودھ کا سِپ لیتے ہوئے بتایا۔

’’پھر سلمان کی طرح ڈریسنگ کیوں کرتا ہے.....؟‘‘

’’ایک تھا ٹائیگر.....‘‘ چھالا دوسری منزل پر کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوئی بولی تھی۔ پپو نے سڑک پر کھڑے ہو کر چھالا کو ایک پوز دیا۔ پھر اِرد گرد دیکھا لوگ تھے وہ چپ چاپ رکشے میں بیٹھ گیا اور اپنے موبائل سے چھالا کا نمبر ملایا چھالا نے جلدی سے کال ریسیو کی۔

’’I Love You‘‘ پپو نے جلدی سے کہہ دیا۔

’’کام پر جاؤ۔۔ میرے ٹائیگر.....نہیں تو.....کاٹ کے رکھ دوں گی۔‘‘ چھالا ادا سے بولی۔

’’جا تو رہا ہوں.....‘‘ پپو نے رکشے میں گیئر میں ڈالتے ہوئے اپنی ہتھیلی پر پھونک مار کر چوما، ہوا کے حوالے کیا۔

’’نادیہ آپی رکشے والا آ گیا.....‘‘ سعود داؤد نے اسکول وین میں بیٹھتے ہوئے آواز لگائی شازیہ گیٹ پر ہی کھڑی تھی اُس نے پپو کو دیکھ کر پاس آنے کا اشارہ کیا اور اپنے ہی گھر کی بیل بھی بجا دی۔

’’السلام علیکم باجی جی!‘‘ پپو نے شازیہ کے پاس آتے ہوئے اسلام کیا۔

’’وعلیکم السلام کیسے ہو بھائی.....؟‘‘ شازیہ نے پپو کا ڈریس دیکھ کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

’’ٹھیک ہوں باجی جی!‘‘

’’تم باڈی گارڈ ہو، دبنگ ہو یا پھر ٹائیگر.....‘‘ شازیہ نے رُک رُک کر پوچھا۔

’’بجرنگی.....نہیں نہیں.....پپو بھائی جان۔‘‘ پپو نے زبان دانتوں تلے دباتے ہوئے جلدی سے بات بدلی۔

’’سلمان جیسے کپڑے کیوں پہنتے ہو.....؟‘‘ شازیہ کو پتا نہیں چلا نادیہ اُس کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

’’باجی جی میری منگیتر ڈیزائنر ہے وہ سی دیتی ہے میں پہن لیتا ہوں۔ وہ چاہتی ہے کہ میں اچھے اچھے کپڑے پہنوں یہ سب اُس کی خوشی کے لیے کرتا ہوں۔‘‘

’’سو سویٹ۔‘‘ شازیہ نے محبت سے کہا۔ نادیہ نے اپنی ماں کو کندھے سے ہلایا اور کہنے لگی:

’’ممّی سائیڈ پر ہٹیں.....کالج سے دیر ہو رہی ہے.....آپ نے پتا نہیں یہ جاننے کے لیے رات کیسے کاٹی ہے.....‘‘ شازیہ سائیڈ پر ہٹ گئی اور نادیہ کو جاتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگی: ’’شریر نہ ہو تو۔‘‘

’’باجی جی! پپو پائلٹ کے ہوتے ہوئے آپ کو کالج سے دیر نہیں ہو سکتی۔‘‘ پپو نے رکشے کا دروازہ کھولتے ہوئے تسلی دی۔

’’ممّی کو بھی باجی جی اور ممّی کی بیٹی کو بھی باجی جی۔‘‘ نادیہ نے رکشے میں بیٹھتے ہوئے اپنی ماں کو بائے بائے کیا تھا۔

کالج سے واپسی پر پپو نے پانچ چھے پان بھی پیک کروا لیے تھے۔

’’باجی جی! یہ پان بھی کھا کر دیکھیں۔‘‘ پپو نے ایک پان نادیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ نادیہ نے عجیب نظروں سے پپو کو دیکھا۔

”نہیں کھانا تو کوئی بات نہیں۔“ پپو وہ پان شاپر بیگ میں ڈالنے لگا تو۔

”دے دو کھا لیتی ہوں۔“ نادیہ نے ایسے کہا جیسے وہ پان کھا کر پپو پر احسان کر رہی ہو۔ رکشا چل پڑا

”تم روز اتنے پان کھاتے ہو.....؟“

”باجی جی! یہ تو چھالا کے لیے ہیں.....!“

”تمھاری درزن کے لیے۔“ پپو یہ سن کر مسکرا دیا۔

”باجی جی! میری خیر ہے چھالا کے سامنے اُسے درزن مت کہہ دینا۔“

”اب فیشن ڈیزائنر تو نہیں کہہ سکتی.....۔ درزن بُرا لگتا ہے تو لیڈیز Tailor کہہ دیتی ہوں۔“

”آپ کے لاہور کی جو بڑی بڑی مشہور فیشن ڈیزائنرز ہیں اُن سب کے کپڑے میری چھالا کے کارخانے سے تیار ہوتے ہیں۔“ پپو نے جذباتی انداز میں بتایا۔

”کون کون سی ہیں.....وہ مشہور فیشن ڈیزائنرز.....؟“ نادیہ نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔ پپو نے سینٹر مرر میں نادیہ کو دیکھا پھر کہنے لگا:

”عالیہ E، ڈیفنس میں زارا Zeel، گلبرگ میں اور بسما B ماڈل ٹاؤن میں.....ان سب کے کپڑے چھالا کے کارخانے سے تیار ہوتے ہیں.....یہ مجھے کسی نے نہیں بتایا میں خود کپڑوں کی ڈلیوری لے کر جاتا ہوں۔“

”اب تو تمھاری چھالا سے ملنا ہی پڑے گا.....پپو ایک بات تو بتاؤ.....؟“

”جی باجی جی پوچھیں.....؟“

”تم اپنی منگیتر کو چھالا کیوں کہتے ہو.....؟“

”باجی جی! اُجالا بچپن میں چھلا کو چھالا کہتی تھی اور میں اُس کا مذاق اُڑایا کرتا تھا۔ وہ توتلی زبان میں باتیں کیا کرتی تھی۔ پتا ہی نہیں چلا کب ہم دونوں جوان ہو گئے۔“ پپو بڑی خوشی سے نادیہ کو سب کچھ بتا رہا تھا۔ نادیہ نے اگلا سوال پوچھ لیا:

”اُس کے گھر میں کون کون ہے.....؟“

”خالو چند سال پہلے مر گیا وہ بھی درزی تھا۔ وہ اُسی کارخانے میں بڑی بڑی فیکٹریوں کا مال سیتا تھا۔ ایک بڑی بہن ہے اُس کی شادی ہو چکی ہے۔ دو چھوٹے بہن بھائی ہیں وہ دونوں اسکول پڑتے ہیں۔ میری خالہ بھی بڑی اچھی ہے۔ میری چھالا کی امّی.....“

”چھالا سے بھی اچھی.....؟“ نادیہ نے فٹ سے پوچھا۔ پپو نے مسکراتے ہوئے نہ میں گردن ہلائی۔

”اچھا یہ بتاؤ چھالا سے تمھاری منگنی کیسے ہوئی.....؟“ نادیہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

''منگنی تو نہیں ہوئی۔ بس ہم دونوں بچپن سے سُنتے آ رہے ہیں کہ ہم دُونوں کی شادی ہوگی۔''

''شادی کب ہے.....؟''

''بڑی عید کے بعد'' پپو نے جلدی سے کہہ دیا۔

''ابھی تو کئی مہینے پڑے ہوئے ہیں تمھاری شادی کو۔ شادی کے بعد بھی رکشا چلاؤ گے.....؟''

''نہیں..... چھالا خود کی ایک بڑی سی بوتیک بنانا چاہتی ہے..... چھوٹی عید کے بعد ایک کمیٹی میری ہے اور آخری چھالا کی۔ اُس سے ہم اپنی بوتیک کھولیں گے۔''

''واہ واہ پپو پائلٹ تم نے تو شادی کی ساری پلاننگ کی ہوئی ہے۔'' نادیہ نے انجوائے کرتے ہوئے کہا۔

''یہ ساری پلاننگ بھی چھالا کی ہے۔ وہ کمیٹی بھی چھالا نے اپنے پاس ڈال رکھی ہے۔ باتوں باتوں میں سفر کا پتا ہی نہیں چلا..... باجی جی ہم پہنچ گئے۔''

وقت کو بھی رکشے کے پہیوں کی طرح پہیے لگ گئے دیکھتے ہی چند ماہ گزر گئے..... نادیہ اور پپو میں دوستی ہو چکی تھی جیسے بہن بھائیوں میں ہوتی ہے۔ اِس عرصے کے دُوران نادیہ اور شازیہ کا پپو اور چھالا کے گھر آنا جانا شروع ہو گیا۔ چھالا بھی کئی بار نادیہ کے گھر جا چکی تھی۔ چھوٹی عید سے ہفتہ پہلے نادیہ کے ڈیڈی نثار احمد دبئی سے عید کرنے آئے۔ آتے ہی انہوں نے ایک چھوٹی زیرو میٹر کار نادیہ کے لیے خریدی۔ چھوٹی عید آن پہنچی عید سے اگلے روز شازیہ اور چھالا نے سلمان خان کی نئی فلم ''سلطان'' کو سینما میں دیکھنے کا پروگرام بنایا اُن کے ساتھ باقی لوگ بھی زبردستی تیار ہو گئے۔ پپو اپنی چھوٹی بہنوں اور چھالا کے ساتھ اپنے رکشے پر سینما پہنچا اور نثار اپنی فیملی کو نئی گاڑی میں لے کر گیا۔

فلم دیکھ کر واپسی گھر جاتے ہوئے نثار احمد نے نادیہ کو خوش کرنے کے لیے شازیہ کو تنگ کیا:

''شازیہ بیگم! سلمان خان کچھ بھی کر لے عامر خان سے اچھا ایکٹر نہیں ہے.....''

''واہ ڈیڈی..... آج آپ نے کھری بات کی ہے.....'' نادیہ نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔ شازیہ نے نثار کو کُہنی مارتے ہوئے جواب دیا:

''تمھارے پاپا سلمان سے چھوٹے ہیں..... اور لگتے سلّو کے ابّو ہیں۔'' داؤد اور سعود کی بتیسی نکل آئی۔

''میری عمر بتانے کی کیا ضرورت تھی بچوں کے سامنے.....'' نثار نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''بتائیں نا..... آپ سلمان سے چھوٹے نہیں ہیں.....؟'' ''میں نے پیار کیا'' جب آئی تھی میں آٹھویں میں تھی اور آپ دسویں میں تھے.....''

''میں نے پیار کیوں کیا.....؟تم سے.....'' نثار احمد مصنوعی غصے سے چلایا۔

پپو اور چھالا دونوں ہی اپنے بہن بھائیوں سے بہت محبت کرتے تھے اُن کو دیکھ دیکھ کر نادیہ بھی بدل گئی وہ اب نہ تو اپنے بھائیوں کو مارتی اور نہ ہی ڈانٹتی۔

''ایک مہینے کی چھٹی تھی تو پھر یہ گاڑی کیوں خریدی.....؟'' شازیہ نے نثار کو اُداس نظروں سے دیکھ کر گلہ کیا۔

''نادیہ کے پاپا، چھوڑ دیں دبئی.....ساری زندگی ہم نے الگ الگ ہی گزار دی.....'' شازیہ نے نم آنکھوں کے ساتھ نثار سے کہا یہ سُن کر نثار سوچ میں پڑ گیا۔اُس نے شازیہ کی اُداسی کو دور کرنے کے لیے بات بدلی:

''نادیہ مجھے ڈیڈی کہتی ہے.....اور تم مجھے اُس کا پاپا بنا دیتی ہو۔''

''سعود، داؤد تو ہمیں ماما پاپا ہی کہتے ہیں نا.....نادیہ تو من موجی ہے بچپن سے سکھا رہی ہوں کہ ماما پاپا کہا کرو.....وہ تو ممّی ڈیڈی ہی کہے گی۔''

''میں تم سب کے پاسپورٹ بنوانا چاہتا ہوں.....''

''وہ کیوں.....؟ پہلے فضول میں گاڑی خریدی.....اب 25 تیس ہزار اور برباد کریں گے.....'' شازیہ نے جلدی سے کہہ دیا۔

''میں بھی تمھارے اور بچوں کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں.....دیکھو نا گرمیوں کی چھٹیاں ہیں.....میں کاروبار کا حرج کر کے تم لوگوں کے پاس آیا ہوں.....گرمیوں کی چھٹیوں اور دسمبر کے چھٹیوں میں تم لوگ میرے پاس آ جایا کرو۔''

''آپ ہی کیوں نہیں دُبئی چھوڑ دیتے.....؟'' شازیہ چڑتے ہوئے بولی۔

''بھولی عورت.....کیسے چھوڑ دوں لگا لگایا کاروبار.....ان شاء اللہ ایک دو سال میں واپس آ جاؤں گا۔'' نثار نے شازیہ کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر کہا۔

''ٹھیک ہے.....پھر یہ گاڑی بیچ دیں ورنہ گیراج میں کھڑی کھڑی برباد ہو جائے گی۔'' شازیہ نے حتمی انداز میں کہا۔

''خریدنے کا سوچا کرو.....بیچنے کا مت سوچا کرو.....نادیہ ڈرائیونگ سیکھ تو رہی ہے.....جب اُسے آ جائے گی تو پھر اپنی گاڑی پر کالج بھی چلی جایا کرے گی۔''

''نادیہ کے پاپا! آپ کی سب میں نے مانی ہیں۔نادیہ کو کالج اکیلے نہیں جانے دوں گی.....''

''پپو تو کہتا ہے.....کہ وہ شادی کے بعد رکشا چلانا چھوڑ دے گا۔'' نثار نے اطلاع دی۔

''پپو کی ایسی کی تیسی میں دیکھتی ہوں وہ اپنی باجی کو کیسے انکار کرے گا۔''

چھٹیوں کے بعد نادیہ کا کالج شروع ہوا پپو اور نادیہ اب روز ایک ایک میٹھا پان کھاتے اور کالج سے واپسی پر ایک ایک کپ

چائے بھی ضرور پیتے۔ایک دن نادیہ پیسے دیتی اور دوسرے دن پپو۔ایسے ہی کالج سے ایک دن واپسی پر پپو اپنا رکشا سڑک کنارے کھڑا کر کے چائے پی رہا تھا۔پپو رکشے کے ساتھ کھڑا تھا اور نادیہ اندر بیٹھی ہوئی تھی۔پپو کے رکشے کے ساتھ ایک کار والے نے اپنی کار پارک کر دی جس کی وجہ سے ٹریفک جام ہوگئی۔ہارن پہ ہارن بج رہا تھا۔ایک شخص اپنی کار سے اُترا اور پپو کو مخاطب کر کے غصے میں چلایا:

"اوئے بے غیرتا اپنے ابّے نوں سائیڈ تے کرلے۔"اُس آدمی نے پپو کو دو چار گالیاں بھی نکالیں پپو نے گالیاں سُن کر بھی اُف نہیں کہا اور خاموشی سے رکشا اسٹارٹ کر کے چل پڑا۔

"تم نے اُسے جواب کیوں نہیں دیا.....میں تمھاری جگہ ہوتی تو اُس کا منہ نوچ لیتی....."نادیہ جذباتی ہو کر بولی۔

"باجی جی غلطی تو میری ہی ہے.....میری وجہ سے ساری ٹریفک جام ہوگئی تھی....."پپو ہولے سے بولا۔

"غلطی تمھاری نہیں تھی.....غلطی اُس کار والے کی تھی جس نے رکشے کے ساتھ اپنی کار کھڑی کی تھی۔"نادیہ نے چیختے ہوئے کہا۔

"باجی جی! سائیکل والا ریڑھی والے کو گالی دیتا ہے اور موٹر سائیکل والے سے کھاتا ہے۔موٹر سائیکل والے کو کار والے سے گالی پڑتی ہے۔کار چھوٹی ہو تو بڑی کار والا اُسے سُنا جاتا ہے۔بڑا افسر اپنے سے چھوٹے افسر کو گالی دیتا ہے اور اپنے بڑے سے کھاتا ہے۔دعائیں دینے والے مرتے جارہے ہیں اور گالیاں دینے والے بڑھتے جارہے ہیں۔ہم رکشے والوں کو تو پیدل سے لے کر مرسڈیز والے تک سب ہی گالیاں دیتے ہیں۔ہم لوگ انسان کی سواری دیکھ کر اُس کی عزت کرتے ہیں۔سواری معمولی ہو تو کم عزت سواری اعلیٰ ہو تو زیادہ عزت۔"

باقی رستے پپو نے کوئی بات نہیں کی نادیہ نے بھی مزید بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

بڑی عید کے چار دن بعد پپو اور چھالا کی شادی تھی۔عید کی چھٹیوں سے پہلے لاسٹ ورکنگ ڈے کی صبح پپو تیار ہو کر چھالا کی کھڑکی کے نیچے پہنچا، پپو رکشے سے اُترا بھی نہیں تھا چھالا سامنے آگئی۔چھالا تو جیسے پپو کے دیدار کے لیے پہلے سے تیار بیٹھی تھی ہلکی ہلکی بُوندا باندی ہو رہی تھی۔پپو آج سلطان بن کر آیا تھا اپنی ملکہ کے دیدار کے لیے۔دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ہمیشہ پپو چھالا کو کال کرتا تھا آج چھالا کی کال آگئی۔پپو نے چھالا کو دیکھتے ہوئے کال ریسیو کی۔

"پپو I Love You"چھالا نے شرماتے ہوئے کہا، پپو نے چھالا کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر جواب دیا:

"آج سورج کدھر سے نکلا ہے۔"

"آج تو سورج نکلا ہی نہیں آج تو بارش ہو رہی ہے....."چھالا نے کھڑکی سے باہر اپنی دائیں ہتھیلی نکالی اُس پر بارش کے چند قطرے پڑے پھر اُس نے اپنی ہتھیلی کو اپنے دائیں گال پر رکھتے ہوئے کہا:

"پپو! میری ایک خواہش یہ بھی ہے کہ میں بارش میں تمھارے ساتھ بھیگوں....."

"ابھی اوپر آ جاتا ہوں چھت پر بھیگتے ہیں۔" پپو چہکتے ہوئے بولا۔

"کاٹ کے رکھ دوں گی..... تمھیں کتنی بار سمجھایا ہے، ابھی نہیں شادی کے بعد....." چھالا نے منہ پھیرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں اپنا فیصلہ سنایا۔

"شادی کے بعد نہ جانے کب بارش ہو.....میں تو کہتا ہوں آج ہی بھیگ لیتے ہیں۔"

"تمھیں کام پر نہیں جانا....." چھالا نے بغیر دیکھے ہی کہا۔

"چہرہ دکھاؤ چلا جاتا ہوں۔" چھالا نے کھڑکی کی طرف منہ کیا اور نظریں جھکا کر کہنے لگی:

"آج تم بڑے اچھے لگ رہے ہو۔" پپو نے یہ سُنا اور وہاں سے چلا گیا۔

"کدھر تھے.....؟ چھالا کے سلطان۔" شازیہ نے جیسے ہی پپو کا رکشا روکا فٹ سے کہہ دیا۔ نادیہ جلدی سے رکشے میں بیٹھ گئی شازیہ اور نادیہ گیٹ پر ہی کھڑی تھیں۔

"کیسی ہیں.....؟ باجی جی!" پپو نے رکشے میں بیٹھے بیٹھے ہی شازیہ سے پوچھا۔

"پہلے ہی تم پورے پانچ منٹ لیٹ ہو.....اب چلو بھی.....اپنی باجی جی کا حال واپسی پر پوچھ لینا....."

"کیوں فکر کرتی ہیں باجی جی! پپو پائلٹ کہتے ہیں مجھے پانچ منٹ پہلے ہی پہنچا دوں گا۔" پپو نے رکشا گیئر میں ڈالتے ہوئے اپنے ارادے ظاہر کیے۔

"آج موسم بڑا سہانا ہے..... چودھری!" امجد نے تیمور کی طرف دیکھ کر اپنے دل کی بات سنائی۔

تیمور نے پجارو کے سائیڈ مرر میں اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کمینی مسکراہٹ چہرے پے سجائے کہا:

"صبح ہی صبح....."

"موسم اچھا ہو تو کیا صبح کیا رات۔" امجد پھر سے بولا۔

"بات تیری دل پہ لگی ہے جانی۔" تیمور نے کچھ سوچتے ہوئے موبائل اُٹھایا۔

"نا چودھری نا.....آج خود کوئی شکار لاتے ہیں۔"

"کوئی ہے نظر میں....." تیمور نے امجد کو غور سے دیکھ کر پوچھا۔

"نظر میں تو نہیں نظر آ جائے گا۔" امجد نے قہقہہ لگاتے ہوئے اپنی کمینگی بتائی۔

"King Edward Medical College، انارکلی اور نیلا گنبد کے درمیانی چوک پر ٹریفک جام تھی دوسری طرف سے گاڑیاں آ رہی تھیں۔ میو ہاسپٹل سے جو روڈ کالج کی طرف جاتی ہے پپو کا رکشا وہاں پہنچ گیا تھا۔

''باجی جی! گھڑی دیکھ لو پانچ منٹ پہلے ہی پہنچا دیا.....میں رکشا چلاتا نہیں اُڑاتا ہوں۔''

''آگے تورش پڑا ہوا ہے.....تم ایسے کرو مجھے یہیں اُتار دو.....'' نادیہ خود ہی جلدی سے رکشے سے اُتر گئی۔

''باجی جی! بارش بھی ہو رہی ہے اور کیچڑ بھی ہے۔ آپ بیٹھو یہ دیکھیں سامنے سے گاڑیاں آ رہی ہیں۔ میں پچھلی گلی سے گھوم کر آپ کو کالج کے گیٹ کے پاس اُتار دیتا ہوں۔''

''ہلکی ہلکی بارش ہے میں چلی جاؤں گی.....'' نادیہ جلدی جلدی کالج کی طرف قدم اُٹھانے لگی.....پپو نادیہ کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''چودھری شکار مل گیا۔'' امجد نے ونڈ اسکرین سے دیکھتے ہوئے تیمور کی توجہ نادیہ پر مبذول کرائی۔ تیمور کی پجارو سامنے کی طرف سے آ رہی تھی۔

''پتا ہے نا.....کیا کرنا ہے.....'' تیمور نے امجد کی طرف دیکھا جو پہلے سے رومال پر لیکوڈ ڈال رہا تھا۔

''اب تو تجربے کار ہو گئے ہیں۔'' امجد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''لے پھر.....'' تیمور نے نادیہ کے پاس پہنچ کر بریک لگائی۔ امجد نے جلدی سے دروازہ کھول کر وہ رومال نادیہ کے منہ پر رکھا۔ نادیہ پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگی۔ پپو یہ دیکھ کر جلدی سے اپنے رکشے سے نکلا اور نادیہ کی طرف بھاگا۔ اس سے پہلے کہ یہ باز اِس معصوم فاختہ کو اپنے پنجوں میں لے کر اُڑتا پپو نے پوری طاقت سے ایک مکا امجد کے منہ پر مارا۔ امجد نادیہ کو اُٹھانے کی بجائے خود زمین پر تھا۔ نادیہ ہوش میں تھی، ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ۔ پپو امجد کی چھاتی پر بیٹھ گیا اور مکے مار مار کر امجد کا منہ لہولہان کر دیا۔ تیمور گاڑی سے اُترا اور آتے ہی پپو کو دو گولیاں مار دیں۔

''پپو بھائی....'' نادیہ درد سے چیخی اور پپو کی طرف لپکی۔ ہلکی بارش کے باوجود جنگلی کبوتر گولیوں کی آواز سے اُڑ پڑے مگر اشرف المخلوقات اپنی اپنی جگہ سے نہیں ہلے بلکہ ڈر سے دُبک گئے۔

ایک لمحے کو سناٹا چھا گیا۔ تیمور نے ٹانگ سے پپو کو دھکا دیا پپو ایک سائیڈ پر گر گیا۔ امجد زمین سے جلدی میں اُٹھا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تیمور نے باری باری دونوں اطراف دیکھا نادیہ پپو کو سنبھالے ہوئے تھی۔ تیمور نے نادیہ کو بالوں سے پکڑ کر امجد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''جانی شکار کے بغیر ہی.....پکڑ اِسے۔'' تیمور نے نادیہ کو پجارو کی پچھلی سیٹ پر دھکا دیا۔

پپو اُٹھا اور پیچھے سے اپنے بازو سے تیمور کی گردن کو جکڑ لیا۔ تیمور نے خود کو پپو کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے دانت پیس کر کہا:

''اوئے تیری جان نکلی نہیں ابھی تک۔''

''بے غیرتا! جان چھوٹی ہے.....اور عزت بہت بڑی ہے۔'' پپو کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔

''لے پھر تیری جان نکال دیتا ہوں۔'' تیمور نے موذر کو پیچھے کی طرف کر کے چلا دیا۔

''مت مارو پپو بھائی کو.....'' نادیہ نے امجد کی گرفت سے خود کو چھڑاتے ہوئے تیمور کو زور سے دھکا دیا۔ پپو کو بچانے کے چکر میں نادیہ اور تیمور گتھم گتھا تھے۔ تیمور پاگلوں کی طرح گولیاں چلائے جا رہا تھا۔ دو گولیاں نادیہ کو بھی لگیں۔ نادیہ اور پپو زمین پر گر گئے۔ تیمور نے وہاں سے کھسکنے میں عافیت جانی وہ سارے لوگ جو اپنی اپنی جگہ پر کھڑے بیٹھے یہ رئیل شوٹنگ دیکھ رہے تھے۔ تیمور کے جانے کے بعد سب اُس طرف بھاگے۔ ایک شور مچ گیا۔

''دونوں ابھی زندہ ہیں۔''

''میو ہسپتال لے چلو۔''

''1122 کو کال کرو۔''

''پولیس کو بلاؤ..... یہ پولیس کیس ہے۔''

تمام خاموش آوازیں ایک ساتھ بلند ہو گئیں۔ چند اللہ کے بندوں نے پپو اور نادیہ کو ہاسپٹل پہنچا دیا۔

اگلے دن نادیہ کو ہوش آیا وہ ہاسپٹل کے بستر پر تھی اُس نے اِردگرد دیکھنے کی کوشش کی سب دُھندلا دُھندلا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے شازیہ کو پہچانا۔

''ممّی! پپو بھائی کیسا ہے؟'' شازیہ نے نثار کی طرف دیکھا جو دُبئی سے آ گیا تھا۔ نثار نادیہ کے پاس آیا اور اُس کے ماتھے پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر کہنے لگا:

''پپو ٹھیک ہے..... ICU میں ہے۔''

اُن کی عید ہاسپٹل ہی میں گزری۔ عید کے چوتھے دن پپو اور چھالا کی شادی والے روز نادیہ کو ہاسپٹل سے چھٹی ملی۔ نادیہ نے ضد کر رکھی تھی کہ وہ پپو کو ملے بغیر اپنے گھر نہیں جائے گی۔ نثار اُسے پپو کے گھر لے گیا۔ پپو کے گھر کے باہر اُس کا رکشا کھڑا تھا۔ نادیہ ویل چیئر پر بیٹھی تھی اُسے گھر کے اندر لے جایا گیا۔ نادیہ نے پپو کی ماں سے پوچھا:

''آنٹی پپو بھائی کہاں ہے؟'' نادیہ نے یہ جملہ کہا ہی تھا گھر میں ایک شور مچ گیا۔ سب زور زور سے رونے لگے۔ نادیہ نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔ چھالا اور پپو کے سب گھر والے موجود تھے۔ چھالا اور پپو ہی نہیں تھے۔

''ڈیڈی مجھے پپو بھائی کی قبر پر جانا ہے۔'' نادیہ کی آنکھوں میں خاموش آنسو تھے..... نثار اُسے قبرستان لے گیا باؤ حمید اُس کے ساتھ تھا۔

''یہ پپو کی قبر ہے..... اور یہ.....؟'' باؤ حمید نے دو قبروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

''اور یہ چھالا کی.....'' نادیہ نے یقینِ کامل سے کہا۔

نادیہ کافی دیر دونوں قبروں کو دیکھ کر روتی رہی پھر باؤ حمید نے نثار کو اشارہ کیا، تو وہ نادیہ کی ویل چیئر کو دھکا لگا کر قبرستان سے باہر لے گیا۔

رات کو نادیہ اپنے بیڈ پر گم صم لیٹی ہوئی تھی۔ شازیہ اُس کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ کرب سے بولی:

''کچھ بات تو کرو.....نادیہ!.....جب سے قبرستان سے آئی ہو.....ایسے ہی بُت بنے لیٹی ہوئی ہو۔''

''بات.....ممّی! میں آپ کو پپو بھائی کی بہادری کی داستان سناتی ہوں اور آپ مجھے چھالا بھابھی کی وفا کی کہانی سنائیں۔''

''پپو نے تو ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم دے دیا تھا۔ اُسی دن عشا کے بعد پپو کا جنازہ تھا..... چھالا نہ روئی نہ ہی اُس نے کوئی بین ڈالے.....ایک آنسو نہیں اُس کی آنکھ سے نکلا.....اگلے دن صبح وہ اپنے بستر پر مردہ حالت میں ملی۔'' شازیہ نے ٹشو سے نادیہ کے آنسو صاف کیے۔

دو دن بعد نثار احمد دبئی چلے گئے اور ہفتے بعد پھر واپس آئے، تو اُن کے پاس اپنی ساری فیملی کے ویزے تھے۔ نثار اور شازیہ نے ہمیشہ کے لیے دبئی شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''ڈیڈی میں تب تک دبئی نہیں جاؤں گی جب تک آپ مجھے اُن بے غیرتوں کے متعلق نہیں بتاتے.....اُن کو سزا ہوئی یا نہیں.....؟''

''نہیں.....'' نثار نے گردن جھکا کر کہا۔

''کیوں ڈیڈی.....؟ آخر کیوں.....؟ اُنھوں نے دو قتل کیے ہیں.....پپو اور چھالا کا.....'' نادیہ نے زخمی لہجے میں پوچھا۔

''اِس لیے کہ یہ پاکستان ہے! یہاں بے قصور جیلوں میں سڑتے ہیں اور قصور وار آزاد گھومتے ہیں.....جس نے پپو کو قتل کیا اُس کا باپ وفاقی وزیر ہے۔ اُن لوگوں نے پپو کے گھر آ کر اُس کی ماں کو ڈرایا.....اُس کی جوان بیٹیوں کو اُٹھانے کی دھمکی دی.....وہ بیچاری بیوہ عورت آخر کیا کرتی اُس نے اپنا کیس ہی واپس لے لیا۔''

''ڈیڈی آپ کی بھی بیٹی کی عزت پر حملہ ہوا تھا.....آپ نے کیا کیا۔؟''

''میں نے تمھاری ماں اور اپنے رشتے داروں کے کہنے پر FIR ہی نہیں کٹوائی تھی۔'' نثار نے شازیہ کی طرف دیکھ کر کہا شازیہ نے بھی اپنی گردن کو ہاں میں جنبش دی۔

''یہ آپ دونوں کے وہی رشتے دار ہیں نا.....؟ جنھوں نے آپ دونوں کی لو میرج کے بعد آپ سے کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔ صرف دادی نے اپنے اکلوتے بیٹے کو نہیں چھوڑا تھا، باقی سب نے آپ دونوں کو چھوڑ دیا تھا۔ ڈیڈی جی! رشتے ہوتے نہیں

ہیں.....بنائے جاتے ہیں، نبھائے جاتے ہیں.....جیسے ایک اجنبی رکشے والا میرا بھائی بن گیا اور بڑی شان سے اپنا رشتہ نبھایا۔'' نثار کی گردن جھکی ہوئی تھی۔شازیہ کے آنسو بہہ رہے تھے۔

''ڈیڈی! میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا ہرگز نہیں ہے میں تو آپ کو حقیقت بتا رہی ہوں۔ میں پپو کو بزدل سمجھتی تھی مگر وہ تو بڑا بہادر نکلا۔آپ بھی بڑے اچھے انسان ہیں.....کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا.....خودغرض بھی نہیں ہیں مگر اِس معاملے میں آپ خودغرضی دکھا رہے ہیں.....جس نے آپ کی عزت بچائی آپ اُس کی عزت کو اِس ملک میں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔یا تو آپ پپو کی فیملی کو بھی ساتھ لے کر چلیں.....اگر ایسا نہیں کر سکتے پھر مجھے بھی یہیں چھوڑ دیں۔''

''شازیہ سمجھاؤ اِسے.....'' نثار غصے سے بولا شازیہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی:

''نادیہ کے پاپا! بات تو ٹھیک ہے ہم دُبئی نہیں جائیں گے۔'' شازیہ نے بھی اپنا فیصلہ سُنایا۔

''تم تو بے وقوف مت بنو۔'' نثار پھر سے غصے میں بولا۔

''ٹھیک ہے، تو پھر رہو تم سب اِس جہنم میں.....'' نثار یہ کہتے ہوئے غصے سے اُٹھ کر چلا گیا۔

''اللہ کرے میرا ملک بھی جنت بن جائے۔جہاں پر سب کو انصاف ملے۔''

''ان شا اللہ.....ایسا ضرور ہوگا.....'' شازیہ نے نادیہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

اگلے دن نثار دبئی اکیلے ہی چلا گیا۔ایک مہینے بعد نادیہ بالکل تندرست ہوگئی تھی۔اُس نے باؤ حمید سے کہہ کر پپو اور چھالا کی قبروں پر کتبے لگوائے۔

نادیہ قبرستان میں گئی تو چھالا کی قبر پر کتبہ نصب تھا جس پر لکھا ہوا تھا:

''وفا کی علامت

عرفان کی اُجالا''

اور پپو کی قبر پر کتبہ نصب تھا

''عزت کا محافظ

شہید پپو پائلٹ''

داستانِ شکست

''خلیل صاحب! آپ نے اپنا ناول 'بقائے ادیب' والوں کو Send کر دیا ہے نا۔'' طاہر اعوان نے چائے کا سپ لیتے ہوئے پوچھا۔

''طاہر! ابھی نہیں بھیجا.....''خلیل مہربان نے بتایا۔

''کمال کرتے ہو خلیل صاحب آپ نے اتنی محنت سے ناول لکھا۔ میں نے بھی پروف ریڈنگ میں جان لگا دی تھی.....اب مقابلے میں بھیجا ہی نہیں۔'' طاہر نے قدرے خفگی سے کہا۔ خلیل مہربان کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''طاہر صاحب! 'بقائے ادیب' والوں نے مقابلے کی آخری تاریخ 31 جولائی کر دی ہے۔ میں نے سوچا ایک دفعہ پروف ریڈنگ ملک جمیل سے کروالی جائے۔''

''خلیل صاحب آپ اپنا نام بھی بدلو۔'' طاہر نے حکمیہ انداز سے کہا۔

''وہ کیوں جی.....؟''خلیل مہربان نے پوچھا۔

''بھائی آپ رائٹر ہو وہ بھی بہت ہی اچھے رائٹر اس مقابلے کے رزلٹ کے بعد آپ دنوں میں مشہور ہو جاؤ گے۔ بس آپ کا نام اولڈ فیشن سا ہے''

''جیوری نام نہیں دیکھے گی کام دیکھے گی''

طاہر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہنے لگا:

''خلیل جبران کی تحریر کے نیچے خلیل مہربان لکھ دیا جائے تو کوئی نہیں پڑھے گا۔ آپ کو نہیں لگتا آپ کا نام جیسے کوئی نیم حکیم یا سنیاسی بابا ہو یا پھر جیسے لاری اڈے کے پاس دیواروں پر لکھا ہوتا ہے عامل خلیل مہربان اب آپ کے شہر میں.....دس دن میں محبوب آپ کے قدموں میں....'' طاہر نے پورا ایکٹ کر کے بتایا۔

''بس.....بس.........لوگ دیکھ رہے ہیں۔''خلیل نے طاہر کو روکا پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھے ہوئے کافی سارے افراد کی نظریں طاہر اور خلیل پر ٹکی ہوئیں تھیں۔

''دیکھنے دو لوگوں کو.....'' طاہر نے بےفکری سے کہا۔

''ہم دونوں مذاق بن رہے ہیں.....''خلیل نے سرگوشی کے انداز میں بتایا۔

''جن بڑے ادیبوں کی تصویروں کے نیچے بیٹھ کر یہ لوگ چائے پی رہے ہیں اِن کے بڑوں نے اِن عظیم ادیبوں کا بھی مذاق اُڑایا تھا۔تصویر سے یاد آیا پاک ٹی ہاؤس میں اس جنریشن کے کسی بڑے رائٹر کی تصویر نہیں ہے۔''

''جیسے.....؟''خلیل نے پوچھا۔

''جیسے قدسیہ احمد، خلیل الرحمٰن قمر..........مل گیا.....مل گیا.....''طاہر نے بلند آواز میں ایسے کہا جیسے کوئی اعلان کر رہا ہو۔

''کیا مل گیا.....؟''خلیل نے ہولے سے پوچھا۔اپنے اردگرد دیکھتے ہوئے کافی لوگ عجیب نظروں سے اُن دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

''مل گیا! آپ کا قلمی نام.....مل گیا.....خلیل خاں ثمر..........خلیل الرحمٰن قمر ہی کی طرح وزن میں ایک دم برابر.....''

''ہزار کوششوں کے باوجود میرا خود کا وزن کم ہو نہیں رہا اوپر سے تم نام کا بھی وزن بڑھا دو.....دوسری بات یہ کہ کہاں خلیل الرحمٰن قمر صاحب اور کہاں میں ۔اِس دور میں ڈراما رائٹنگ میں جہاں دوسرے رائٹر تاروں کی طرح چمک رہے ہیں وہیں قمر صاحب اُن سب کے بیچ میں قمر ہی کی طرح روشن ہیں۔''

''Too Much ہوگی.....؟''طاہر نے جلدی سے کہا۔

''کیا.....؟''خلیل نے لاعلمی سے پوچھا۔

''قمر صاحب کی تعریف.....''طاہر نے جواب دیا۔خلیل کے مکھڑے پر مسکراہٹ نے قدم رکھے۔

''کم ہے.....وہ اتنا بہترین مکالمہ لکھتے ہیں زبان خود بخود ''واہ'' کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔''

''خلیل صاحب میں نکلتا ہوں.....مجھے دیر ہو رہی ہے.....''

''میں ڈراپ کر دیتا ہوں.....بس یہ کتاب لائبریری میں رکھنے دو۔''خلیل نے اپنے براؤن بیگ سے اپنی دوسری کتاب نکالی اُس پر لکھا For پاک ٹی ہاؤس نیچے Date ڈالی اور اپنے سائن کیے۔طاہر یہ سب کچھ بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔''

''خلیل صاحب آپ اپنے سائن کی جگہ انگوٹھا ہی لگا دیا کرو.....''چھی''اتنے غیر مہذب سائن.....میں پھر کہہ رہا ہوں ایک تو اپنا وزن کم کریں اور دوسرا اپنے سائن بہتر بنائیں۔میں نے آج تک آپ جتنے صحت مند رائٹر نہیں دیکھے۔رائٹر تو بیچارے شکل ہی سے مسکین لگتے ہیں اور آپ.....''

''بڑھا ہوا پیٹ اور بڑھے ہوئے ریٹ مشکل ہی سے کم ہوتے ہیں.....''خلیل نے اپنی کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔اپنی کتاب پاک ٹی ہاؤس کے مینجر کو دی اور خود دونوں وہاں سے نکل گئے۔

''نومی! ابھی بھی وقت ہے سمجھاؤ اپنے بھائی کو۔اچھا بھلا دبئی میں لگا لگایا بزنس چھوڑ آیا ہے۔میں نے کہا پراپرٹی کا کام ہی

کرلو.....کہتا ہے رائٹر، ڈائریکٹر ہی بنوں گا۔'' راؤ طارق اپنی رائے رکھ رہا تھا نوید احمد عرف ''نومی'' خلیل مہربان کے چھوٹے بھائی کے سامنے نومی کے چہرے پر بھی کچھ فکر تھی۔

''راؤ صاحب! خلیل بھائی کے فیوچر کی مجھے بھی بہت فکر ہے چار بچے ہیں اُن کے، جن میں سے تین اسکول جاتے ہیں اوپر سے گھر کے خرچے اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر رائٹنگ کر رہے ہیں۔''

''جب تک یہ مولوی ملک جمیل اور کیا نام ہے اُس لڑکے کا وہ جو ہیرو سا دکھتا ہے اور کلین شیو ہے..... ہاں یاد آیا.....طاہر یہ خلیل کے ساتھ ہیں تیرا بھائی ٹھیک رستے پر نہیں آ سکتا۔ جتنی ہوا میں نکالتا ہوں وہ دونوں اُس سے ڈبل خلیل میں پھر بھر دیتے ہیں۔''

''راؤ صاحب! بھائی لکھتے تو اچھا ہیں.....میں نے اُن کی دونوں کتابیں پڑھی ہیں.....مجھے تو صرف اِس بات کی فکر ہے اُن کی یہ سٹرگل آخر کب تک چلے گی۔''

''بس تھوڑے دنوں کی بات ہے.....پھر دیکھنا.....تم یہ ناول ''بقائے ادیب'' کو آج ہی بھیج دو۔'' ملک جمیل نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خلیل سے کہا۔

''ملک صاحب کیسا لگا۔'' خلیل نے جھجک سے پوچھا۔

''کیسا ہے.....کیا مطلب.....؟'' ''بہت ہی اعلیٰ'' خلیل میاں تم نے کمال کر دیا۔ کیا منظر نگاری کی ہے اوپر سے اتنے اعلیٰ مکالمے لکھے ہیں۔ خلیل میاں فکر نہ کرو بس اللہ کا نام لے کر بھیج دو پہلا انعام تمھیں ہی ملے گا۔''

''ناول پڑھنے کے بعد طاہر نے بھی یہی کہا تھا۔'' خلیل نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ ناول کے متعلق طاہر کی رائے ملک جمیل کو بتائی۔

''ہاں یاد آیا.....طاہر نے میرا نیا قلمی نام ''خلیل خاں ثمر'' رکھا ہے.....کیسا ہے؟''

''بہت اچھا ہے.....اِس ناول کو اپنے نئے نام سے ہی سے بھیجو.....''

''مگر میں تو خاں نہیں ہوں.....'' خلیل معصومیت سے بولا۔

''جنھوں نے اپنے نام کے ساتھ خاں لگایا ہے وہ کون سے خاں ہیں۔ آج کل خاں فیشن میں اِن بھی ہے۔ جس نام کے ساتھ خاں لگ جائے وہ کامیابی کی ضمانت بن جاتا ہے۔''

''جمیل تم بھی.....طاہر میں تو کچھ لڑکپن ہے.....وہ کہے تو اور بات ہے تم تو میچور آدمی ہو۔''

''تخلص اور قلمی نام کچھ بھی ہو سکتا ہے.....خلیل خاں ثمر صاحب اپنا ناول آج ہی بھیج دو.....ان شا اللہ ایک لاکھ کا انعام تمھیں ہی ملے گا۔''

''لاکھوں کا کاروبار چھوڑ چھاڑ کر.....ایک لاکھ انعام کے چکر میں پڑا ہوا ہے.....'' ''ہے نا مت ماری گئی''.....تم لوگ اسے

سمجھاتے کیوں نہیں میرا ایسا بھائی ہوتا تو کب کا ٹھیک ہو جاتا.....''

راؤ طارق کار ڈرائیو کرتے ہوئے خلیل کی بیوقوفیوں پر بھڑک رہا تھا اور نومی اُس کی باتوں پر مسکرا رہا تھا۔

''تم مسکرا رہے ہو..... پاگل ہو گیا ہے خلیل۔ چند دن پہلے 1500 روپے کا ایک چیک مجھے دکھا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا طارق دیکھ میری پہلی کمائی پھر اُس چیک کو فریم میں سجایا اور اب اُسے اپنے کمرے میں لگا رکھا ہے۔''

''راؤ صاحب اُن کا شوق ہے، کرنے دیں.....'' نومی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''تم سب کو کیا ''گیدڑ سنگھی'' سونگا رکھی ہے خلیل نے بھابی بھی اُسے نہیں سمجھاتی.....''

''بھابی تو جنتی روح ہے.....'' نومی نے کہا ہی تھا کہ راؤ طارق کے موبائل کی گھنٹی بج گئی۔

''یہ لو میری جہنمی روح کی کال آ گئی۔'' موبائل اسکرین دیکھتے ہوئے۔

''جی جانو.....''

''کہاں ہو.....؟'' دوسری طرف سے آواز آئی

''ائیر پورٹ جا رہا ہوں..... جانو.....۔''

''کس کو ریسیو کرنے جا رہے ہو۔''

''ریسیو کرنے نہیں چھوڑنے جا رہا ہوں۔''

''کس کو؟'' آواز میں تلخی تھی۔

''نومی کو۔''

''نومی کون.....؟'' غصے کے ساتھ پوچھا۔

''وہ اپنا خلیل مہربان ہے نا جس کی کتابیں تمھیں دی تھیں اُس کا چھوٹا بھائی ہے۔''

''خلیل صاحب کا چھوٹا بھائی، تو پھر ٹھیک ہے..... Ok Bye''

''میری بیوی بھی خلیل کی کتابیں پڑھنے کے بعد کملی ہو گئی ہے..... کہتی ہے خلیل صاحب کی PC میں دعوت کروں گی۔'' راؤ طارق نے کال ریسیو کرنے کے بعد کہا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی ائیر پورٹ پر رُکی تو نومی مسکراتے ہوئے گاڑی سے اُترا اور کہنے لگا:

''راؤ صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ ویسے ایک بات ہے بھابی پر آپ کا رُعب خوب ہے۔''

''تعریف کر رہے ہو یا جگت لگا رہے ہو.....'' راؤ طارق نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ نومی نے مصنوعی سنجیدگی سے جواب دیا:

''آف کورس تعریف کر رہا ہوں راؤ صاحب! میری فلائٹ کا وقت ہو گیا ہے میں چلتا ہوں۔''

''کب تک جانا ہے..... بھابھی۔''شاہین خلیل نے پوچھا وہ موبائل پر اپنی بڑی بھابھی سے بات کر رہی تھی۔

''اگلے مہینے ایک لاکھ پچیس ہزار کی تو بات ہے۔''

''ایک لاکھ پچیس ہزار؟''شاہین نے اپنی بھابھی کے الفاظ دہرائے۔

''ہاں ناں..... تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے کروڑوں کی بات ہو..... خلیل مہربان کے پاس بڑے پیسے ہیں۔ اُسے کہو مجھے عمرہ کروانے کی مہربانی بھی اب کر ہی دے..... شاہین میری بات غور سے سن تمھارا بھائی ہے، امی ہیں اور میں بھی ہوں۔ ہم سب جا رہے ہیں محرم کا بھی مسئلہ نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے بھابھی..... اویس کے بابا آتے ہیں تو میں بات کرتی ہوں۔ اللہ حافظ۔''شاہین موبائل بند کر کے سوچ میں پڑ گئی۔

''کیا سوچ رہے ہو..... خلیل میاں.....؟''جمیل نے خلیل کی نظروں کے تسلسل کو توڑا جو مسلسل شاہی قلعے اور بادشاہی مسجد کو دیکھے جا رہی تھیں۔ جمیل، خلیل اور طاہر فورٹ ویو ریسٹورنٹ کی چھت پر کھانے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں سے بادشاہی مسجد اور شاہی قلعہ بہت حسین نظر آتے ہیں۔ یہ اکتوبر کی ایک رات تھی طاہر اپنے موبائل پر Busy تھا۔ جمیل نے اپنا رشین سیلڈ ختم کرنے کے بعد خلیل کو مخاطب کیا۔

''کچھ خاص نہیں..... جمیل میں سوچ رہا ہوں انسانوں کا گھر بھلے ہی شاہی قلعہ ہی کیوں نا ہو ایک دن کھنڈر بن جاتا ہے اور اللہ کا گھر ہمیشہ آباد رہتا ہے..... اب خود ہی دیکھ لو مسجد کے صحن میں کیسے نور کی بارش ہو رہی ہے اور قلعے کے اندر کیسی ظلمت، تاریکی اور اُداسی ہے۔''

''جمیل بھائی! یہ اُداسی رزلٹ کی ہے کل 10 اکتوبر ہے اور خلیل صاحب کو اپنے رزلٹ کی فکر ہے۔'' طاہر نے اپنا i Phone سامنے ٹیبل پر رکھا اور خلیل کی اُداسی کی وجہ بتائی۔

''خلیل میاں! اُداسی کیسی.....؟ تم ان شاء اللہ پہلے نمبر پر ہی آؤ گے۔''جمیل نے خلیل کے کندھے پر محبت سے ہاتھ رکھا۔

''بالکل میں بھی یہی کہہ رہا ہوں..... خلیل صاحب کی کہانی بہت Unique ہے.....''

''کھانا کھلانا پڑے گا..... اِسی جگہ..... خلیل میاں۔''جمیل نے اگلی دعوت پکی کی۔

''ضرور کیوں نہیں.....''

''اور مٹھائی بھی.....''طاہر نے جلدی سے کہا۔

''زینت ابصار بھی مٹھائی لے کر جاتی ہیں۔''خلیل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''کس کی بات کر رہے ہو.....؟''جمیل نے پوچھا۔

"زینت ابصار اکثر بقائے ادیب کے دفتر مٹھائی لے کر جاتی ہیں۔"

"تو..... اِس میں کیا ہے..... آپ کو مٹھائی پر اعتراض ہے یا زینت کے بقائے ادیب کے دفتر جانے پر۔" طاہر نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

"یہ اُس دن کی بات ہے..... جس دن قدسیہ احمد سے میری میٹنگ تھی۔ اُس دن زینت ابصار بھی وہیں تھی وہ الماس انیس اور قدسیہ احمد کے درمیان میں بیٹھی تھی۔ اور قدسیہ احمد کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔"

"تم بھی کمال کرتے ہو خلیل میاں اب تم دو عورتوں کے ہنسنے کو شک کی نگاہ سے دیکھو گے۔"

"ملک صاحب! اُن میں سے ایک اُس مقابلے کی جج ہیں اور دوسری عورت نے اُس مقابلے میں حصہ لیا ہے۔" خلیل کی بات سن کر طاہر مسکراتے ہوئے کہنے لگا:

"زینت ابصار اور قدسیہ بی بی آپس میں اچھی دوست بھی تو ہو سکتی ہیں۔ خلیل صاحب! آپ کو یہ لگ رہا ہے کہ کہیں آپ کی جگہ پہلی پوزیشن زینت ابصار کو نا دے دی جائے....."

"لگ تو نہیں رہا بس کچھ وہم سا ہو گیا ہے۔ اُن دونوں کی قربت دیکھ کر....." خلیل نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بائی داوے..... یہ زینت ابصار ہے کون.....؟" جمیل نے پوچھا۔

"من کے محلے میں، کی رائٹر..... کھاتے پیتے گھرانے کی لگتی ہیں محترمہ، دکھنے میں بھی ڈیسنٹ سی خاتون ہیں۔"

"من کے محلے میں، کی دو قسطیں میں نے بھی دیکھی ہیں..... اچھا لکھتی ہے..... پر خلیل میاں تجھ سے اچھا نہیں تو فکر نہ کر..... پہلا انعام تجھے ہی ملے گا۔" جمیل نے پھر سے خلیل کا حوصلہ بڑھایا۔ ویٹر نے ٹیبل پر کھانا لگانا شروع کر دیا۔

"کھانا لاؤں.....؟" شاہین نے محبت سے خلیل کو دیکھتے ہی پوچھ لیا جو گیراج میں گاڑی پارک کرنے کے بعد اپنے کمرے میں جانے کے لیے جلدی سے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ شاہین کو کچھ تشویش ہوئی وہ اُس کے پیچھے لپکی خلیل نے جلدی سے لیپ ٹاپ Open کیا۔

"آخر ہوا کیا ہے..... آپ کیوں اتنے پریشان ہیں.....؟" شاہین نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ابھی ابھی رضوان اور فرح کا میسج آیا ہے..... کہ داستانِ اُلفت میں میری تیسری پوزیشن آئی ہے۔" خلیل نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بتایا۔

"یہ تو خوشی کی بات ہے..... اتنے بڑے مقابلے میں آپ Top 3 میں ہیں....."

"تم تیسری پوزیشن پر خوشیاں منا رہی ہو..... میرا دل دوسری پوزیشن کے متعلق سوچ کر بیٹھ جاتا ہے۔" خلیل نے سرخ چہرے

کے ساتھ جواب دیا۔وہ جلد سے جلد بقائے ادیب، کا فیس بک پیج Open کرنا چاہ رہا تھا۔اُس کی نظریں لیپ ٹاپ کی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں چند لمحوں بعد ہی اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک خوبصورت پوسٹ تھی۔

داستان الفت کا پہلا انعام آپ کے سامنے پیش ہے۔بیسٹ پریذنٹیشن یعنی بہترین اور پروفشنل طریقے سے کہانی پیش کرنے کا یہ انعام جیتنے والے تمام مصنفین کو''بقائے ادیب''ٹیم کی طرف سے مبارک باد۔

''یا اللہ تیرا شکر ہے۔''خلیل نے گہری ٹھنڈی سانس بھری اور پانی کی بوتل کو منہ لگا کر کتنا ہی پانی غٹا غٹ پی گیا۔شاہین نے اُس کا یہ رویہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''اویس کے بابا.....کیا ہو گیا ہے آپ کو.....؟ آپ تو اپنے بچوں سے کہتے ہیں.....بیٹا کسی سے مقابلہ کرنے کے بجائے خود سے مقابلہ کرو.....ہمارے بچے آپ کا یہ جذباتی پن دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے۔''

''شاہین تم نہیں سمجھ سکتی.....ابھی تو''بقائے ادیب''نے میرا نام سے صرف''ثمر''ہی اُڑایا تھا،تو میری جان نکل گئی۔''

''ثمر.....مطلب.....؟''

''میں نے خلیل خاں ثمر کے نام سے ناول بھیجا تھا۔انہوں نے میرا نام صرف خلیل خاں لکھ دیا۔Thank Good بقائے ادیب نے میرے نام سے صرف ثمر ہی اُڑایا ہے، مجھے بے ثمر نہیں کیا۔''

''اتنا جنون اِس کام کے بارے میں.....''شاہین نے خلیل کے گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔خلیل کھل اُٹھا اور کہنے لگا:

''ممتاز مفتی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے جب آپ کا شوق آپ کا کام بن جائے تو اِس سے بڑی عیاشی کوئی نہیں ہوتی۔اب میں بھی زندگی میں عیاشی کرنا چاہتا ہوں۔10 سال دبئی میں یہ کام کرنے کے لیے اتنی محنت کی ہے۔مولانا جلال الدین رومی اپنی کتاب مثنوی میں فرماتے ہیں موت کا ذائقہ تو سب چکھتے ہیں زندگی کا ذائقہ کوئی کوئی ہی چکھ پاتا ہے،میں اب زندگی کا ذائقہ چکھنا چاہتا ہوں۔''

شاہین نے خلیل کا موڈ بہتر پایا تو 1500 کے چیک کی طرف دیکھا جو خوبصورت فریم میں سجا تھا اور پھر کہنے لگی:

''یہ چیک وہ حرا والی کہانی کا ہے نا.....''

''ہاں.....''خلیل کی آواز میں فخر تھا۔

''اِسے آپ کیش کروا کر کسی غریب کو دے دیں۔''شاہین کی بات سن کر خلیل سوچ میں پڑ گیا پھر بولا:

''یہ ٹھیک ہے صبح ہی کیش کروا کر کسی ضرورت مند کو دیتا ہوں۔''

''یہ مقابلہ جیتنے کے آپ کے کتنے فیصد چانس ہیں.....؟''

''100%.....''خلیل نے پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔

"یہ کیسے کہہ سکتے ہیں آپ.....؟ آپ خود ہی تو کہتے ہیں اپنی کہانی اپنے بچے کی طرح ہوتی ہے.....اب کوئی بھی والدین اپنے بچے کو بُرا تھوڑی کہتے ہیں۔"

"جب آپ کے بچے کی دوسرے تعریف کریں.....تو بچہ واقعی ہی اچھا ہوتا ہے۔" خلیل نے چمکتی آنکھوں سے جواب دیا۔

"مطلب.....؟"

"مطلب.....یہ کہ جمیل اور طاہر نے میرا ناول پڑھا ہے انہیں تو مجھ سے بھی زیادہ پسند آیا....."

"وہ دونوں کون سا لکھتے ہیں.....ویسے بھی وہ تو آپ کے دوست ہیں وہ تو اچھا ہی کہیں گے نا....." شاہین نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔

"جمیل نے سارا اُردو ادب پڑھا ہوا ہے۔ کیا سمجھتی ہو اُسے.....وہ تو آدھا صفحہ پڑھ کر رائٹر کا نام بتا دیتا ہے اور جہاں تک طاہر کی بات ہے اُس نے ماسٹر کیا ہے میڈیا کمیونیکیشن میں سید منصور کے ساتھ 3 فلمیں اسسٹ کر چکا ہے۔ اسکرپٹ کو بڑی باریک بینی سے سمجھتا ہے۔ طاہر آج کل ایک بڑے چینل میں جاب کر رہا ہے۔ جتنی تنقید وہ دونوں میرے کام پر کرتے ہیں نا تمھاری سوچ ہوگی۔ اِس دفعہ اُن دونوں کی ایک ہی رائے ہے۔"

"اچھا ایک بات تو بتائیں.....آپ ایک لاکھ جیت گئے تو اُن پیسوں کا کیا کریں گے.....؟"

"کیا کروں گا.....ابھی سوچا نہیں.....تم بتاؤ.....؟"

"اگر عمرہ کر لیا جائے....."

"مطلب.....میں سمجھا نہیں....."

"مطلب یہ بھائی محمود بھابھی بینا اور امی عمرہ کرنے جا رہے ہیں اگلے مہینے.....بھابھی بتا رہی تھیں صرف ایک لاکھ پچیس ہزار ہی خرچہ آئے گا۔ میرے پاس کمیٹی والے تیس ہزار ہیں ایک لاکھ انعام والا میرا عمرہ آرام سے ہو جائے گا....." شاہین نے اپنے دل کی بات آخر گھما پھرا کر کہہ ہی دی۔

"اتنی کہانی سنانے کی کیا ضرورت تھی۔ تم ویسے ہی مجھ سے ایک لاکھ تیس ہزار لے لو.....اور عمرہ کر آؤ۔"

"مجھے پتا ہے پلاٹ خریدنے کے بعد آپ کا ہاتھ "ٹائٹ" ہے میں نے تو اِس لیے کہا ہے کہ آپ تنگ نہ ہوں۔"

"ہاتھ تو تنگ ہے پر اتنا بھی نہیں کہ تمھیں عمرے کے پیسے نہ دے سکوں....."

"عمرہ تو میں انعامی رقم ہی سے کروں گی....." شاہین نے حتمی انداز میں کہا۔

"ہاں یاد آیا.....کل امی بھی آ رہی ہیں....." شاہین نے اطلاع دی۔

''بڑی پھوپھو آرہی ہیں.....'' شاہین نے ہاں میں گردن کو جنبش دی۔

''خلیل صاحب! آج فلم کا پروگرام بناتے ہیں۔'' طاہر نے فون کرنے کے بعد پہلی بات یہی کہی تھی۔

''نہیں یار داستانِ اُلفت کے رزلٹ آنا شروع ہو گئے ہیں۔

''اگر آپ دوسرے نمبر پر بھی آئے پھر بھی آپ کی باری تو 5 چھ دن بعد ہی آئے گی۔ آج تو صرف 11 ویں اور دسویں پوزیشن کا ہی اعلان ہوگا۔''

''شُب شُب بول طاہر.....دوسری پوزیشن کی بات نہ کر اب تو میں نے انعامی رقم سے تیری بھابھی کو عمرہ کروانا ہے۔ آج فلم نہیں.....ویسے بھی رزلٹ دیکھنے کا بڑا مزہ آرہا ہے.....ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی تہوار ہو۔''

''جیسے آپ کی مرضی.....Ok Bye'' طاہر نے فون کٹ کر دیا۔ 9 بجے ہی سے خلیل لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھ گیا شاہین اُس کی اسٹڈی میں آئی اور کہنے لگی:

''چھ ماہ سے یہ ''ڈمر'' یہاں پڑے ہوئے ہیں، انہیں اسٹور میں رکھ دوں.....وزن تو آپ کا کم ہونا نہیں ہے۔''

''آج تم سارے ہی اُلٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو۔ پہلے طاہر نے بکواس کی ہے اور اب تم شروع ہو گئی ہو۔''

''اویس کے بابا آپ سمجھتے کیوں نہیں کارپٹ خراب ہو رہا ہے۔'' خلیل نے شاہین کی بات سُنی اَن سُنی کر دی اور کہنے لگا:

''تم گرین ٹی لے کر آؤ.....اور خبردار جو ڈمر یہاں سے اُٹھائے۔'' چند منٹ بعد شاہین خلیل کے پاس گرین ٹی رکھ کر چلی گئی۔

داستانِ اُلفت کے آج کے رزلٹ پیشِ خدمت ہیں۔ نادیہ کاشف نے نہ صرف بہترین طریقے سے اپنی تحریر پیش کی بلکہ ایک انتہائی معیاری تحریر بھی لکھی۔ نادیہ کاشف کو پوری ٹیم کی طرف سے بے حد مبارک ہو۔

''زندگانی 11 از نادیہ کاشف۔''

خلیل نے گرین ٹی کی چسکی لی اور جمیل کا نمبر ملایا۔

''خلیل میاں! کیسے ہو.....'' جمیل نے کال ریسیو کرتے ہی کہا۔

''اللہ کا بڑا کرم ہے.....ملک صاحب 11 ویں نمبر کا اعلان ہو گیا ہے زندگانی از نادیہ کاشف۔''

''تم فکر نہ کرو تمھارا نام ابھی بڑی دور ہے۔''

''کیسے فکر نہ کرو ملک صاحب۔''

''فکر نہ کر میرے بادشاہ! مجھے جودان کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے واپس آ کر بات کرتا ہوں۔ اللہ حافظ۔'' خلیل نے فون بند کیا اور اپنے بچوں کے کمرے میں گیا سب سو چکے تھے۔ شاہین بھی اپنے سب سے چھوٹے بیٹے زید کو سُلاتے سُلاتے خود بھی سو گئی تھی۔

11 بجنے والے تھے وہ اپنے لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھ گیا اُسے پیٹ میں کچھ گڑبڑسی محسوس ہوئی وہ واش روم چلا گیا۔ واپس آیا تو 10 ویں پوزیشن کا اعلان ہو چکا تھا۔

”داستانِ الفت میں ہمارے اگلے ونر ہیں خلیل خاں بقائے ادیب ٹیم کی طرف سے آپ کو بہت بہت مبارک خلیل۔“

”داستانِ اُلفت 10 م سے محبت از خلیل خاں۔“

خلیل نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے گالوں پر رکھے ہوئے تھے اور وہ بُت بنا لیپ ٹاپ کی اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے تھے دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اِس دوران اُسے ملک جمیل نے فون کیا۔ گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ ملک جمیل نے دوسری بار کال ملائی تو خلیل کا دھیان اُس طرف گیا۔

”ہیلو.....“ خلیل نے رُندھی ہوئی آواز کے ساتھ کہا۔

”کیا ہوا خلیل میاں خیریت تو ہے.....؟“ ملک جمیل نے فکرمندی سے پوچھا۔

”سب برباد ہو گیا ہے.....“ خلیل بولا۔

”اللہ خیر کرے..... آخر ہوا کیا ہے کچھ بتاؤ تو سہی.....“

”10 ویں نمبر کا اعلان ہو گیا ہے..... م سے محبت از خلیل خاں۔“ خلیل نے رُک رُک کر بتایا۔

”یہ دھاندلی ہوئی ہے۔“ ملک جمیل نے فٹ سے کہہ دیا۔

”ملک صاحب! یہ کون سا الیکشن تھا جو دھاندلی ہوگی.....“ خلیل نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

”خلیل میاں! تم مانو یا نا مانو یہ دھاندلی ہی ہے اتنی اچھی تمھاری تحریر تھی وہ 10 ویں نمبر پر کیسے آسکتی ہے۔ تمھاری تحریر میں بڑے لوگوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ کہانی بھی مختلف تھی۔ میں 7 آٹھ سال کی عمر سے کہانیاں پڑھ رہا ہوں 32 سال ہو گئے ہیں مجھے کتابیں پڑھتے ہوئے..... دال میں ضرور کچھ کالا ہے.....“

”ملک صاحب آپ کالے کی بات کر رہے ہیں میری تو دال والی ہانڈی ہی اُلٹ گئی..... رکھتا ہوں۔“ خلیل نے پریشانی کے عالم میں موبائل بند کر دیا۔

خلیل نے اپنا لیپ ٹاپ بند کیا اور لیٹ گیا۔ نیند کہاں تھی اُس کی آنکھوں میں اُس نے رائٹنگ ٹیبل کے نیچے پڑے ہوئے ڈمروں کی طرف دیکھا اور انہیں اُٹھا کر چھت پر چلا گیا چھت پر وہ اپنا غصہ ورزش کر کے نکالنے لگا وہ گھنٹا بھر ایکسرسائز کرتا ہے جب پسینے سے شرابور ہو گیا تو واپس اپنے کمرے میں آیا فجر تک نا جانے کتنی ہی کروٹیں وہ اپنے بستر پر لے چکا تھا مگر نیند اُس کے نصیب میں نہ تھی اُس نے فجر کی نماز اپنے کمرے میں ہی ادا کی اور پھر اپنے بستر پر لیٹ گیا نماز سے اُسے کافی سکون ملا تھا اور اُس کی آنکھ لگ گئی۔ شاہین

دوبارہ اُس کے کمرے میں آئی خلیل کو سوتا دیکھ کر وہ واپس چلی گئی 12 بجے کے قریب شاہین نے خود اُسے جگایا تھا۔

''خیریت تو ہے.....آپ تو کبھی بھی اتنی دیر تک نہیں سوتے''

''خیریت ہی تو نہیں ہے.....''خلیل نے افسردگی سے کہا۔

''کیوں کیا ہوا.....؟''

''میں 10 ویں نمبر پر آیا ہوں.....''

''بس اتنی سی بات.....''شاہین نے ایسے کہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''تمھیں یہ اتنی سی بات لگ رہی ہے.....''

''ہاں نا.........اویس کے بابا آپ خود ہی تو کہتے ہیں.....انسان کو کسی کے شمار میں رہنا چاہیے.....اوپر نیچے سے کچھ نہیں ہوتا۔آپ بقائے ادیب کے شمار میں تو ہیں نا..... 10 سے زیرو ہٹا دیں تو 1 بن جاتا ہے۔آپ نے صرف ایک زیرو ہٹانا ہے تو آپ بن نمبر 1.....''چلیں اُٹھیں میں ناشتا لے کر آتی ہوں۔''

''مجھے ناشتا نہیں کرنا.....تم جاؤ یہاں سے.....''خلیل نے خفگی سے کہا اور پھر تکیہ سر پر رکھ کر لیٹ گیا شاہین چلی گئی۔تھوڑی دیر بعد خلیل اُٹھا اور بقائے ادیب کا پیج اوپن کیا اور رات والی پوسٹ کو غور سے دیکھنے لگا۔اُس نے 10 نمبر کے زیرو پر شہادت والی انگلی رکھی تو اُسے ایک نظر آیا انگلی ہٹائی تو پھر دس بن گیا۔وہ ایک معصوم بچے کی طرح کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر فسٹ ایڈ باکس سے سنی پلاسٹ نکال کر لایا اور اُسے کاٹا پھر زیرو کے اوپر چسپاں کر دی۔اب اسے سُرخ پوسٹ اچھی لگ رہی تھی۔

''داستانِ اُلفت 1 م سے محبت از خلیل خاں۔''

وہ وقتی طور پر کھل اُٹھا اُس نے اُن سب لوگوں کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے اُسے 10 ویں پوزیشن کی مبارک بادیں دی تھیں۔اِسی دوران اُس کا سب سے چھوٹا بیٹا زید روم میں آیا اور اُس کی گود میں بیٹھ گیا۔اُس نے لیپ ٹاپ کی اسکرین سے سنی پلاسٹک اُتار دی 1 پھر سے 10 بن گیا۔خلیل پھر اُداس ہو گیا وہ اپنے کمرے سے نکلا۔

''نی شاہین چارج گئے ہیں.....خلیل نے صبح سے کچھ نہیں کھایا اُسے دیکھ کیا ہوا، وہ نیچے بھی نہیں آیا.....''شاہین کی ماں نسرین بول رہی تھی۔

''امی وہ پریشان ہیں۔''شاہین نے بتایا۔

''کیسی پریشانی۔''نسرین نے حیرانی سے پوچھا۔

''وہ مقابلہ نہیں جیت سکے.....''شاہین نے کچن میں کام کرتے ہوئے وہیں سے آواز لگائی۔

''سوگ تو ایسے منا رہا ہے جیسے اُس کی ماں مر گئی ہو۔''

''ماں کیوں مرے ساس کیوں نہ مر جائے.....''خلیل نے سیڑھیاں اُترتے ہوئے جواب دیا۔

''دیکھ شاہین خلیل مجھے مرنے کی بددعائیں دے رہا ہے.....''شاہین کی ماں نے گِلے کے انداز میں کہا۔

''مرنے کی بددعائیں نہیں دے رہا پھوپھو.....جواب دیا ہے۔''خلیل نے اپنی پھوپھو کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو روایتی بات کہہ دی تھی۔''نسرین نے اپنی بات کی وضاحت پیش کی۔

''میں نے بھی پھوپھو روایتی جواب ہی دیا تھا۔''

''تیرے باپ کو گود میں کھلایا ہے۔ تیری ماں کو خود بیاہ کر لائی ہوں۔اتنی سی بات بھی نہیں کہہ سکتی۔''نسرین نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''پھوپھو.....سوری.....میرا موڈ خراب تھا اِس لیے زبان سے نکل گیا۔''خلیل نے اپنی پھوپھو کے گلے لگتے ہوئے کہا چند سیکنڈ میں ہی پھوپھو نسرین کا غصہ ہوا ہو گیا۔

''تجھے شاہین نے بتایا ہوگا ہم سب عمرے پر جا رہے ہیں.....''

''ہاں پھوپھو بتایا ہے میں کل بینک سے کیش نکال لوں گا آپ کل روپے لے کر ہی جائیے گا۔''

''میں نہیں جاؤں گی.....''شاہین نے خلیل کے سامنے ناشتا رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''وہ کیوں.....؟''خلیل نے حیرت سے پوچھا۔

''میں ان شا اللہ عمرہ ضرور کروں گی، مگر دبئی کی کمائی سے نہیں۔ بلکہ قلم کی کمائی سے۔''خلیل اُس کی بات پر مسکرا دیا ناشتا کیا اور اپنے کمرے میں آیا۔قلم اُٹھایا اور لکھنا شروع کر دیا۔

جمیل، طاہر اور خلیل پھر سے فورٹ ویو ریسٹورنٹ کی چھت پر تھے ہلکی ہلکی دھند تھی موسم خوشگوار تھا۔

''آج کا کھانا خلیل صاحب کی طرف سے۔''طاہر نے جلدی سے خود ہی خلیل کی طرف سے دعوت کا اعلان کر دیا۔

''وہ کس خوشی میں.....''خلیل نے پوچھا۔

''آپ کو 10 ہزار انعام جو ملا ہے۔''طاہر نے جلدی سے جواب دیا۔

''ساڑھے چھے ہزار تو ناول کی کمپوزنگ پر ہی لگ گئے تھے۔''خلیل نے جلدی سے بتایا۔

''ہم ساڑھے تین ہزار کے اندر ہی کھانا کھا لیں گے، کیوں طاہر میاں۔''

''جی جی ملک صاحب۔''طاہر نے جلدی سے ملک جمیل کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''سچ کہوں تو بقائے ادیب کا نئے لکھنے والوں پر احسان ہے، میں ہی غلط تھا جو فیصلے پر اعتراض کر رہا تھا جو ٹاپ تھری کے ونر ہیں اُن میں سے تو دو بالکل نئی لکھاری ہیں اور مزے کی بات زینت ابصار ٹاپ تھری میں نہیں ہے۔ خلیل تم خوامخواہ اُس بیچاری کو شک کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔

''ملک صاحب! زینت ابصار 4th پوزیشن پر ہیں۔'' خلیل نے جلدی سے بتایا۔

''ملے تو! انہیں بھی 10 ہزار ہی ہیں نا.....'' طاہر نے تبصرہ کیا۔

''انعام کے دس ہزار بہت ہوتے ہیں طاہر صاحب میں تو سوچ رہا ہوں اگلے سال میں بھی داستانِ اُلفت میں حصہ لوں۔ خلیل ایک کام ضرور کرنا تمھارے علاوہ جو 12 ناول ہیں وہ سب کے سب ضرور پڑھنا اور اپنی غلطیوں کا احاطہ کرنا۔ اگر ہو سکے تو مجھے بھی پڑھنے کے لیے دینا۔''

''خلیل صاحب! آپ اگلے سال پھر مقابلے میں حصہ لیں گے۔؟'' طاہر نے پوچھا۔

''طاہر میاں! یہ کیوں حصہ لے گا یہ تو تب تک مشہور TV رائٹر بن چکا ہوگا۔ طاہر تمھیں کیا لگتا ہے ہم تینوں سے کہا غلطی ہوئی؟''

''ملک صاحب! اس میں کوئی دورائے نہیں خلیل بھائی اچھے رائٹر ہیں۔ مجھے لگتا ہے م سے محبت ناول بقائے ادیب کے مطلوبہ کونٹینٹ کے مطابق نہیں تھا۔'' طاہر نے سوچ کر جواب دیا، خلیل غور سے طاہر اور جمیل کا تبصرہ سُن رہا تھا۔ جمیل نے خلیل پر نظر ڈالتے ہوئے کہا:

''مطلب یہ کہ..... بقائے ادیب نے غلام علی کی مانگی اور خلیل میاں نے بڑے غلام علی کی بھیج دی۔'' تینوں نے مل کر قہقہہ لگایا۔

''تم دونوں کتنے کمینے ہو! اب کیسے دانشور بن رہے ہو۔ راؤ طارق ٹھیک کہتا ہے تم دونوں مجھ میں ہوا بھرتے ہو۔''

''خلیل صاحب! آپ اپنے ناول کا نام ''م سے محبت'' کی جگہ ''ناول دس نمبری'' رکھ دیں۔'' طاہر نے خلیل کی ٹانگ کھینچی۔

''یا پھر..... ''داستانِ شکست''، جمیل نے جگت لگائی۔

''کمینوں مجھے رائٹر ڈائریکٹر بننے دو تم دونوں کو منہ نہیں لگاؤں گا۔'' خلیل نے ہنستے ہوئے جواب دیا چند لمحے خاموش رہا پھر بادشاہی مسجد کی طرف دیکھ کر کہنے لگا:

ان شاءاللہ میں اپنی شکست کو فتح کی سیڑھی بناؤں گا۔

کُنڈی نہ کھولنا

پرانے وقتوں کی بات ہے۔ وہ پُو کے جھاڑے کی ایک رات تھی۔ عشا کی نماز کے بعد گاؤں کے بڑے بوڑھے اپنے اپنے لحافوں میں گھُسے پڑے تھے۔ سردی اتنی کہ دانت سے دانت ٹکرا رہے تھے۔ چودھری جہانگیر کے ڈیرے پر دیسی کیکر کے کوئلے انگیٹھی میں دہک رہے تھے، جس کی وجہ سے وہ بڑا سا کمرا قدرے گرم تھا۔ کچھ کوئلوں کی تپش باقی سانسوں کی حرارت، ماحول تو بہتر ہونا ہی تھا۔ اتنے میں منگتو چینی کے پیالوں میں گرم چائے لے کر آ گیا، سب سے پہلے اُس نے چودھری جہانگیر کو چائے کا پیالہ پیش کیا چودھری جہانگیر نے گاؤ تکیے پر اپنی کُہنی رکھتے ہوئے اپنے آپ کو اُوپر کی طرف اُٹھایا، حقے کی نلی ایک طرف کی اور منگتو کے دونوں ہاتھوں سے وہ چائے کا پیالہ اُٹھالیا۔ منگتو نے چودھری جہانگیر کی رضائی خود ہی اوپر کی طرف کرتے ہوئے اپنی خدمت گزاری کا ثبوت پیش کیا۔ اُس کے بعد منگتو نے نجی لوہار، تاجو کمہار، ناظر ترکھان، مولوی صادق، سُو دانائی، آبی بیوپاری اور کالے موچی سے ہوتے ہوئے دوسرے لوگوں کو بھی چائے دی۔

چائے پکڑتے ہوئے بابے خیرے نے منگتو سے پوچھا:

”وڈے چودھری جی کہاں ہیں۔۔؟“

”وڈے چودھری جی.....آپا کے سسرال گئے ہیں، کل یا پرسوں آئیں گے۔“

”اچھا.....“ بابے خیرے نے کانپتے ہاتھوں سے چائے کی چسکی لیتے ہوئے صرف ایک لفظ کہا۔

”چودھری جی! وہ مَج (بھینس) بڑی ہی سوہنی تھی۔“ آبی بیوپاری نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

”اب کھول مت لانا۔“ منگتو نے جلدی سے کہہ دیا سب ہنس پڑے۔

”کھولنے کا کام تو کالے کا ہے۔“ ناظر ترکھان نے ہنستے ہنستے کہا۔ کالے موچی نے ناظر ترکھان کو گھورتے ہوئے جواب دیا:

”تیرے پاس کون سی مَج ہے جو میں کھولوں گا۔۔؟“

”کالے نے سچی پکی توبہ کر لی ہے.....اب تو یہ پنج ویلے مسیت (پانچ وقت مسجد) میں آتا ہے۔“ مولوی صادق نے کالے موچی کی تعریف کی۔

”مولوی صادق! کچی مٹی پکنے کے بعد نہیں بدلتی۔“ تاجو کمہار نے اپنے تجربے کی بات بتائی۔

”لوہار کی بھٹی کے پاس بیٹھو گے تو کپڑے تو جلیں گے نا۔“ نجی لوہار نے اپنی سُنا دی۔

''نجی کھل کر بات کر.....'' چودھری جہانگیر نے چائے کی آخری چسکی لینے کے بعد کہا۔منگتو نے دونوں ہاتھوں سے خالی پیالہ چودھری کے ہاتھ سے لیا۔

''چودھری جی! کالے کی بیٹھک اب بھی دریا پار کے چوروں کے ساتھ ہے۔'' نجی لوہار نے اپنی بات کی وضاحت کی۔نجی کے ساتھ بیٹھتے ہوئے سُودے نائی کو بے چینی ہورہی تھی کیونکہ اِس ساری گفتگو میں اب تک اُسے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملا تھا وہ جلدی سے بول پڑا:

''چودھری جی! دیگ کچی ہے یا پکی وہ پتا کرنے کے لیے چاول کا ایک دانہ ہی کافی ہوتا ہے۔''

''ایک دوسرے کے کپڑے اُتارتے رہتے ہو کبھی مسیت میں بھی آجایا کرو.....فجرے (صبح) ہم چار پانچ بندے ہی ہوتے ہیں، مسیت میں۔'' چودھری جہانگیر نے کچھ خفگی سے کہا۔

''آنکھ ہی نہیں کھُلتی.....چودھری جی!'' ناظر ترکھان نے جلدی سے کہا۔آبی بیوپاری کی سوئی وہیں اُٹکی ہوئی تھی وہ پھر سے بولا:

''چودھری جی! چودھری ریاست کو وہ مَج آپ کو بیچ دینی چاہیے تھی ہم آٹھ بندے اُس کے ڈیرے پر گئے تھے.....اُس نے ڈیرے پر آیوں کی بھی نہ لاج رکھی۔''

''بالکل.....ہاں جی.....گل تو ٹھیک ہے.....کھری بات.....سچ اے.....صحیح کہا تو نے.....'' باقی چھے نے اپنے اپنے الفاظ میں آبی بیوپاری کی تائید کی صرف چودھری جہانگیر خاموش تھا وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔اُس نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔باقی کام منگتو نے سرانجام دیا منگتو نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے سب کو ہاتھ کے اشارے سے وہاں سے چلے جانے کا کہہ دیا۔سب لوگ دبے پاؤں چلے گئے۔

وہ گھر گیا تو بیوی بچے سو رہے تھے۔اُس نے اپنے گھر کی باہر سے کُنڈی لگائی اور نکل پڑا۔وہ یخ ٹھنڈی سیاہ رات تھی سناٹا اتنا کہ اپنی سانس کا شور بھی سنائی دے۔وہ کچی پگڈنڈیوں پر چلتا رہا۔کئی گندم کے کھیتوں میں سے گزرا، گندم کے ہزاروں ننھے پودے اُس کے قدموں سے کُچلے گئے اب وہ دریا کے کنارے پر تھا۔اُس نے جوتے اُتارے اور اپنی بغل میں دبا لیے دریا اُترا ہوا تھا، اُس میں پانی تو گھٹنے گھٹنے ہی تھا مگر برف سے زیادہ ٹھنڈا اُس نے دریا بھی پار کیا سامنے چودھری ریاست کا ڈیرا تھا۔اُسے معلوم تھا چودھری ریاست کے دو بُو لی کُتے رات کے اِس پہر میں کہیں سے بھی نکل کر اُس پر حملہ کر سکتے ہیں پھر بھی وہ ڈیرے کی طرف چل پڑا۔بھینسوں کے ڈھارے (کمرے) میں گیا وہ بھینس پہچانی جو چودھری جہانگیر کو پسند آئی تھی۔اُس کے تین دن کے کٹے (بچے) پر پرانی بوری ڈالی پھر اُسے اپنے کندھوں پر اُٹھایا بھینس کی رسی کھولی اور واپس چل پڑا۔واپسی کا سفر اُس نے دوسرے رستے سے کیا وہ کئی گنے کے کھیتوں کے پاس سے گزرا، ڈیرے پر پہنچا بھینس ڈھارے میں باندھی اُسے چارہ ڈالا، کٹے کو کھلا چھوڑ دیا اور ڈھارے کی باہر سے کُنڈی لگا دی۔

دوسری طرف چودھری جہانگیر نے ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔ انگیٹھی میں دہکتے کوئلے بھی سو گئے تھے مگر چودھری کو نیند نہ آئی۔ مولوی صادق کی آواز چودھری جہانگیر کے کانوں میں پڑی فجر کی آذان ہو رہی تھی اُس نے اپنی رضائی ہٹائی اور مسجد چلا گیا۔

مسجد میں صرف پانچ افراد تھے۔ مولوی صادق نے امامت کی اُس کے پیچھے بابا خیرا، بابا دینا، کالا موچی اور چودھری جہانگیر تھا۔

دن چڑھا سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ عصر کے بعد پھر سے چودھری جہانگیر کے ڈیرے پر رونق لگ گئی۔ رات والے سارے لوگ تھے، سوائے کالے موچی اور مولوی صادق کے۔ مولوی صادق تو اِس وقت بچوں کو مسجد میں قرآن شریف پڑھاتا تھا اِس لیے وہ وہاں موجود نہیں تھا کالے موچی کی کسی کو خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں ہے۔

منگتو صحن میں رات کو انگیٹھی میں جلانے کے لیے لکڑیاں کاٹ رہا تھا اندر بڑے سے کمرے میں سب لوگ حقوں سے دھواں نکال رہے تھے۔ چودھری جہانگیر کمرے میں داخل ہوا سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ اونچے، نیچے، موٹے، باریک کئی سُروں میں چودھری جہانگیر کو سلام کیا گیا۔

چودھری جہانگیر نے سلام کا جواب دیا اور اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا سب لوگ بیٹھ گئے۔ ابھی سب لوگ بیٹھے ہی تھے۔

چودھری ریاست بڑے جلالی انداز میں کمرے میں داخل ہوا اُس کے پیچھے آٹھ دس لوگ اور بھی تھے جن میں سے آدھوں کے کندھوں پر بندوقیں تھیں اور باقی کے ہاتھوں میں لمبی لمبی ڈانگیں جن کے اوپر گنڈا سے لگے ہوئے تھے۔

آؤ..... بسم اللہ..... چودھری ریاست.....'' چودھری جہانگیر نے بڑے تپاک سے بانہیں کھولتے ہوئے چودھری ریاست کا استقبال کیا اور اُسے اپنے برابر میں بیٹھنے کے لیے جگہ دی۔

منگتو.....! اوئے منگتو.....! چودھری جہانگیر نے بڑے وقار سے منگتو کو آواز لگائی۔

''جی چودھری جی.....'' منگتو فٹ سے بھاگتا ہوا آ گیا۔

''چودھری ریاست آیا ہے روٹی ٹکر کا بندوبست کر۔''

''نا..... چودھری..... نا..... آج روٹی ٹکر نہیں.....'' چودھری ریاست تلخی سے بولا۔ اُس کا رویہ دیکھ کر چودھری جہانگیر کو تشویش ہوئی۔

''خیر تو ہے.....؟''

''خیر ہی تو نہیں ہے..... تجھے بھینس نہیں بیچی..... تو.....؟ اُسے تو نے چوری کروا لیا۔''

''چودھری ریاست! تو میرے ڈیرے پر آیا ہے اِس لیے لحاظ کر رہا ہوں۔''

''لحاظ.....؟ لحاظ تو نے رکھا ہی کب ہے..... چودھری جہانگیر! میرے ڈیرے سے سیدھا کھرا تیرے ڈیرے پر آیا ہے۔ اوئے

کرمُو کھوجی بتاتا کیوں نہیں چودھری کو۔'' کرمُو کھوجی بڑے اعتماد سے اُٹھ کر چودھری جہانگیر کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور اپنی گردن کو ہاں میں جنبش دی۔ ڈیرے پر بیٹھے افراد کے درمیان کُھسر پُھسر شروع ہو گئی۔

''کالا موچی کہاں ہے.....؟'' تاجو کمہار نے ناظر ترکھان کے کان میں سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔ ناظر نے اردگرد دیکھا کالا موچی کہیں نظر نہیں آیا۔

''وہ مَجّ چوری ہو گئی.....؟'' آبی بیوپاری نے اپنے دائیں بائیں نجی لوہار اور سُودے نائی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تم سب اِدھر آؤ.....'' وہ پانچوں ہاتھ باندھے چودھری جہانگیر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ چودھری نے جانچتی نگاہوں سے سب کو دیکھا۔

''اگر تم میں سے کسی نے چوری کی ہے تو ابھی بتا دے..... بعد میں..... میں چور کی کھال اُتار دوں گا۔'' سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر آبی بیوپاری آگے بڑھا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا:

''نا..... نا..... چودھری..... ہم میں سے یہ کام کسی نے بھی نہیں کیا''

''منگتو.....! سارے گاؤں میں دیکھ کر آ.....'' چودھری جہانگیر نے غصے سے حکم دیا۔ منگتو کے پیچھے پیچھے ہی آبی، پپو، نجی اور سُودا بھی چلے گئے۔

''چودھری جی! کالے موچی کی خبر لے کر آؤں.....؟'' ناظر ترکھان نے دبے لفظوں میں پوچھا۔ چودھری جہانگیر نے آبرو کے اشارے سے اجازت دی۔

''چودھری جی! کُھرا آپ کے ڈیرے سے آگے نہیں جاتا۔'' کرمُو کھوجی نے ڈرتے ڈرتے عرض کی۔

''کرمُو..... سوچ سمجھ کر بات کیا کر..... اب چودھری جہانگیر چوری کی بھینسیں اپنے ڈیرے پر باندھے گا۔'' چودھری جہانگیر نے کرمُو کو غصے سے ڈانٹ دیا۔

''چھوٹے چودھری! تو ایک بار دیکھ تو سہی..... کُرمو کھوجی کا کُھرا آج تک غلط ثابت نہیں ہوا.....''

بابا خیرا بول پڑا، چودھری جہانگیر نے غصے سے بابے خیرے کی طرف دیکھا اور اُسے کہا کچھ نہیں شاید وہ اُس کی سفید داڑھی کا لحاظ کر گیا تھا۔

اتنے میں منگتو پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔

''چودھری جی! سب جگہ دیکھ آیا ہوں بھینس کہیں نہیں ہے۔'' منگتو کے پیچھے پیچھے ہی ناظر ترکھان بھی آ گیا اُس نے بھی نفی میں گردن ہلائی تھی۔

''منگتو! کیا بھینس ہمارے ڈیرے پر ہے.....؟'' چودھری جہانگیر نے جلال سے پوچھا۔منگتو نے جلدی سے حیرت کے ساتھ سوالیہ انداز میں جواب دیا:

''ہمارے ڈیرے پر.....؟ ناں.....ناں.....جی۔''

تاجو، آبی، سُودا اور نجی وہ سب لوگ بھی واپس آ گئے۔

''چودھری جی! سارا گاؤں دیکھ لیا ہے۔۔مَجّ (بھینس) نہیں ملی۔'' آبی بیوپاری نے گردن جھکا کر اطلاع دی۔

''چودھری ریاست! تیری بھینس مل جائے گی۔فکر نہ کر.....اُوئے تم سب کالے موچی کو ڈھونڈ کر لاؤ۔'' چودھری جہانگیر نے یقینی انداز میں کہا۔

''رہنے دو اوئے.....کالے موچی کو..... چودھری! کھرا تیرے ڈیرے پر آتا ہے اور تو سارے گاؤں کی تلاشی لے رہا ہے۔ صرف اپنے ڈیرے کی تلاشی لے لے بھینس مل جائے گی۔'' چودھری ریاست نے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔اُس کا انداز اور لہجہ چودھری جہانگیر کو لڑ گیا تھا۔وہ غصے سے اُبل پڑا۔

''چودھری ریاست! میں پھر سے تیرا لحاظ کر رہا ہوں۔اِس لیے کہ تو اِس وقت میرے ڈیرے پر بیٹھا ہے۔'' چودھری جہانگیر نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔

''تو مت کر لحاظ اور اپنے ڈیرے کی تلاشی دے دے۔'' چودھری ریاست نے بھی تلخی سے جواب دیا۔

''تلاشی.....؟ آج تک تو ایسا ہوا نہیں.....اور آگے بھی نہیں ہوگا۔'' چودھری جہانگیر نے حتمی انداز میں جواب دیا۔

''اگر تو تلاشی نہیں دے گا.....؟ پھر کُنڈی کھولنی پڑے گی!'' چودھری ریاست نے بھی اپنا فیصلہ سُنا دیا۔

''کُنڈی.....؟ کُنڈی کھولنی پڑے گی.....؟ چودھری کو.....؟ ایک بھینس کے لیے.....! کالے کا ہی کام لگتا ہے۔۔! کہیں ذبح ہی نہ کر لی ہو۔'' چودھری جہانگیر کے حمایتیوں نے اپنی حیرت اور فکرمندی کا اظہار اپنے الفاظ میں کیا۔چودھری جہانگیر نے کچھ دیر سوچا پھر اُٹھ کر چل پڑا۔

''چل چودھری ریاست.....!''

مغرب کی آذان سے کچھ دیر پہلے مولوی صادق نے قرآن شریف پڑھنے والی بچیوں کو چھٹی دی۔مسجد سے گھر جانے کے لیے نکلا، مسجد کے دروازے کی باہر سے کُنڈی لگائی اور چلا گیا ابھی وہ گھر کے اندر داخل ہی ہوا تھا، گلی میں سے گزرتے ہوئے ہجوم کا شُور اُس کے کانوں میں پڑا وہ جلدی سے باہر آیا گلی میں سب سے آگے چودھری جہانگیر اور اُس کے ساتھ چودھری ریاست چلتے ہوئے مسجد ہی کی طرف جا رہے تھے۔اُن دونوں کے پیچھے بہت سارے لوگ تھے مولوی صادق کو تشویش ہوئی اور وہ بھی اُن کے پیچھے چل پڑا۔مسجد کے

دروازے کے سامنے پہنچ کر چودھری جہانگیر اور چودھری ریاست کھڑے ہو گئے۔ چودھری ریاست نے مسجد کے دروازے کی باہر سے لگی ہوئی کُنڈی دیکھ کر پھر سے طنزیہ انداز میں کہا۔

''چودھری جہانگیر! اگر تو سچا ہے تو۔۔؟ کھول دے مسجد کی کُنڈی..... تیرا میرا فیصلہ ہو جائے گا۔'' چودھری جہانگیر نے ایک نظر چودھری ریاست کی طرف ڈالی پھر اپنے قدم مسجد کے دروازے کی طرف اُٹھائے جیسے جیسے چودھری جہانگیر کے قدم مسجد کی طرف اُٹھ رہے تھے لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بڑھ رہی تھی سب کی سانسیں ساکن ہو چکی تھیں۔

سب کی پلکوں کے کواڑ کھلے ہوئے تھے سب کی آنکھوں کے آئینوں میں دو ہی تصویریں تھیں چودھری جہانگیر اور مسجد کی کُنڈی۔ چودھری جہانگیر نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا پھر دوسری پر اب اپنے ہاتھ کُنڈی کھولنے کے لیے بڑھائے اُس نے دایاں ہاتھ کُنڈی پر رکھا ہی تھا ہجوم میں سے ایک آواز بلند ہوئی:

''کُنڈی نہ کھولنا.....! چودھری جی..... کُنڈی نہ کھولنا۔'' سب کی نظروں نے اُس آواز کا تعاقب کیا جس میں بے شمار درد تھا۔ مولوی صادق نظریں جھکائے کھڑا تھا اور روتے ہوئے زور زور سے کہہ رہا تھا:

''کُنڈی نہ کھولنا.....! چودھری جی..... کُنڈی نہ کھولنا..... وہ بھینس میں نے چوری کی تھی۔'' چودھری جہانگیر کا ہاتھ رُک گیا اور وہ اُلٹے پاؤں مسجد کی دونوں سیڑھیاں اُتر آیا۔ سارے ہجوم کی نظروں کا مرکز و محور مولوی صادق تھا۔ اِس سے پہلے کہ مولوی صادق کو لعنت ملامت ہوتی ایک بزرگ گھوڑی پر بیٹھ کر وہاں آیا اور مسجد کی کُنڈی کھول کر چپ چاپ مسجد میں داخل ہو گیا۔

''ابّا جی.....'' چودھری جہانگیر نے منہ میں کہا۔

''وڈے چودھری جی.....!'' ہجوم میں سے کئی دبی دبی آوازیں سنائی دیں۔

چودھری اکبر نے صحن میں کھڑے ہو کر کلمہ حق بلند کر دیا، مغرب کی اذان سنتے ہی سب سے پہلے چودھری جہانگیر مسجد میں داخل ہوا اُس کی دیکھا دیکھی سارا کا سارا گاؤں مسجد داخل ہو گیا سب سے آخر میں مولوی صادق جھکی ہوئی گردن کے ساتھ مسجد میں داخل ہوا تھا۔ آذان ختم ہو گئی مگر مولوی کے مصلحے پر کوئی کھڑا نہ ہوا۔

''مولوی صادق! آگے آ اور نماز پڑھا۔ جو کوئی بھی مولوی صادق کو بُرا آدمی سمجھتا ہے وہ اِس کے پیچھے نماز نہ پڑھے۔'' بڑے چودھری نے اعلان کی طرز پر حکم دیا۔ مولوی صادق نظریں جھکائے لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا مصلحے تک پہنچا اور مغرب کی نماز پڑھائی۔ گاؤں کے سب لوگوں نے مولوی صادق کے پیچھے نماز ادا کر لی۔ سوائے چودھری ریاست اور اُس کے ساتھیوں کے۔

عید کے بعد آج پہلی بار اتنے نمازی گاؤں کی مسجد میں تھے۔ دعا کے بعد پھر چودھری اکبر بولا:

''نماز کے بعد سارے لوگ ڈیرے پر آ جائیں۔''

چودھری ریاست اور اُس کے ساتھیوں نے جماعت کے بعد اپنی نماز ادا کی ۔نماز کے بعد مسجد تقریباً خالی ہوگئی۔گاؤں کے سارے لوگ جا چکے تھے صرف چودھری اکبر اور بابا خیرا بیٹھے ہوئے تھے۔چودھری ریاست بھی اُٹھ کر جانے لگا تھا۔

''ریاست پُتر فیصلہ تو کرتے جاؤ.....!''چودھری اکبر نے ریاست کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اُسے بٹھالیا۔

''تایا جی! جس گاؤں کا امام ہی چور ہو.....اور گاؤں کے مالک اُس کے سرپرست ہوں.....وہاں فیصلہ.....؟''چودھری ریاست نے پھیکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

''وہ امام کے ساتھ ساتھ.....انسان بھی تو ہے.....اور انسان ہی غلطیاں کرتے ہیں۔''بابے خیرے نے کہا۔

''غلطی.....غلطی سے ہوتی ہے اور چوری جان بوجھ کر کی جاتی ہے۔''چودھری ریاست نے خفگی سے جواب دیا۔

''جو غلطی تو نہ کرے اور چوری کر بیٹھے اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے.....؟''چودھری اکبر نے مولوی صادق کی صفائی کے ساتھ ساتھ لگے ہاتھوں ریاست سے مشورہ بھی مانگ لیا۔

''تایا جی! مجھے اجازت دیں.....آپ نے اور آپ کے گاؤں نے مولوی کے حق میں فیصلہ تو پہلے ہی دے دیا ہے۔''چودھری ریاست نے گِلے کے انداز میں کہا۔

''نہ پُتر میں نے تو زندگی میں کبھی بھی فیصلے نہیں کیے.....میں نے تو صرف لوگوں کو معاف کیا ہے.....تو میرے ساتھ ڈیرے پر چل میں رب کے گھر میں بیٹھا ہوں، جو فیصلہ تو کرے گا میں اُس پر آمین کہوں گا۔''چودھری اکبر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔چودھری اکبر کے بعد بابا خیرا بول پڑا:

''وڈے چودھری نے تو کوئی بھی فیصلہ نہیں کیا.....فیصلے کے لیے گواہوں کی ضرورت پڑتی ہے۔فیصلہ یہ نہیں ہے کہ مولوی چور ہے یا پھر چوکیدار بلکہ فیصلہ تو یہ ہے کہ مولوی اچھا ہے یا بُرا.....؟چور، چوری کرے تو ہاتھ ضرور کاٹنے چاہئیں اگر ساری عمر کی چوکیداری کے بعد.....!چوکیدار غلطی کر بیٹھے.....تو لوگوں سے صلاح (رائے) کرلو.....وڈے چودھری نے بھی لوگوں کی صلاح ہی لی ہے۔کیوں کہ زبانِ خلق نقارہ خدا ہے.....اِسی لیے سارے گاؤں والوں نے مولوی کے حق میں گواہی دی ہے۔بات کرنے سے بات ختم ہوتی ہے۔اپنی سُنا اور مولوی کی سُن.....وڈے چودھری نے کہا ہے نا.....جو فیصلہ تو کرے گا.....ہمیں قبول ہوگا.....''بابے خیرے کی باتوں کے بعد چودھری ریاست خود ہی اُٹھ کر ڈیرے کی طرف چل پڑا۔

سب لوگ پہلے ہی ڈیرے پر پہنچ چکے تھے۔

''پُتر ریاست اپنی بات سب کو بتا''وڈے چودھری نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''تایا جی! کل میرے ڈیرے پر چودھری جہانگیر اور اُس کے سات ساتھی آئے تھے جن میں مولوی بھی تھا.....چودھری نے

میری بھینس کی قیمت لگائی۔میں نے کہا اِس بھینس کو چھوڑ کر چودھری جہانگیر تو کوئی بھی پسند کر لے۔چودھری جہانگیر نے کہا تو قیمت بول۔میں نے وہ بھینس دینے سے انکار کر دیا چودھری نے مولوی صادق کو بھیج کر وہ بھینس چوری کروالی۔"

یہ بات سُن کر مولوی صادق گردن جھکائے کھڑا ہو گیا۔

"تو بول مولوی صادق....." بڑے چودھری نے بولنے کی اجازت دے دی۔

"چودھری جی! میں نے بھینس چوری کی ہے.....میں مانتا ہوں.....مگر.....نا ہی کسی کے کہنے پر اور نہ ہی اپنے لیے۔"

"پھر تو نے چوری کیوں کی۔؟ اور اِس وقت وہ بھینس کہاں ہے۔" بڑے چودھری نے تحمل سے پوچھا۔

"وہ بھینس آپ کے ڈیرے کے پیچھے جو ڈھارا (کمرا) ہے وہاں ہے اور چوری میں نے چودھری جہانگیر کی خوشی کے لیے کی تھی۔"

"جہانگیر کی خوشی.....؟" بڑے چودھری نے حیرت سے پوچھا۔

"جی چودھری جی.....آپ نے اور چھوٹے چودھری نے ہمیشہ گاؤں والوں کی خوشی کا خیال رکھا ہے۔اگر میں چوری نہ کرتا تو کوئی اور کر لاتا مگر ہم چھوٹے چودھری کو اُداس نہیں دیکھ سکتے.....چھوٹے چودھری جی جب سے بھینس کے بغیر، چودھری ریاست کے ڈیرے سے آئے تھے اُن کا منہ لٹکا ہوا تھا۔۔جو مجھ سے دیکھا نہیں گیا۔تب ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ جو بھی ہو وہ بھینس چھوٹے چودھری کے ڈیرے پر ضرور آئے گی۔"

"تجھے ڈر نہیں لگا..... یہاں سے چار میل دور ہے میرا ڈیرا.....میرے ڈیرے پر دو بُو لی کُتے بھی ہیں۔وہ تجھے کچا ہی کھا جاتے....." چودھری ریاست نے حیرت سے پوچھا۔اُس کے فوراً بعد بابے خیرے نے تشویشی انداز میں مولوی صادق سے سوال کیا:

"مولوی صادق! عشا کی نماز تو نے پڑھائی پھر ہمارے ساتھ یہاں آ گیا.....یہاں سے بھی ہم سب اکٹھے ہی اُٹھے تھے.....فجرے بھی سب سے پہلے تو ہی مسیت میں پہنچا تھا۔بھینس تو کب لے کر آیا.....؟"

"بابا! یہاں سے جانے کے بعد میں گھر گیا سب گھر والے سُو رہے تھے۔میں نے گھر کی باہر سے کُنڈی لگائی اور نکل پڑا.....راتوں رات بھینس لے کر آ گیا.....بھینس ڈھارے میں باندھی۔گھر آ کر نہایا کپڑے بدلے اور مسیت میں آ کر آذان دی۔" سارا ہجوم مولوی صادق ہی کی زبانی اُس کی چوری کا قصہ بڑے شوق اور حیرت سے سُن رہا تھا۔

"رستے میں بہت سارے کماد (گنے) کے کھیت بھی ہیں، کوئی بارلہ یا بھگیاڑ (سُور یا بھیڑیا) تجھے مل جاتا.....تو.....؟" چودھری جہانگیر نے پوچھا۔

"میں جی آیۃ الکرسی پڑھتا ہوا گیا تھا اور واپس بھی پڑھتا ہوا آیا تھا اور کتوں کا بندوبست بھی میں نے کیا ہوا تھا.....کالا موچی کہتا

ہے بڑے سے بڑے خونخوار کتے کو گُڑ کھلا دیا جائے تو وہ کچھ نہیں کہتا۔ گُڑ بھی میرے کھیسے (جیب) میں ہی تھا، مگر مجھے چودھری ریاست کے بُو لی کُتے مِلے ہی نہیں'' مولوی صادق نے بھولے پن سے جواب دیا۔

سب مولوی صادق کی بات سُن کر ہنس پڑے اور دیر تک قہقہوں کا شور رہا۔ اُس کے بعد بڑے چودھری نے اپنا دایاں ہاتھ ہوا میں بُلند کیا تو شور یک دَم ختم ہو گیا۔

''ریاست پُتر! تو اب خود ہی فیصلہ کر دے.....'' بڑے چودھری نے کہا۔

''ریاست نے مولوی کی طرف دیکھا جس کی گردن جھکی ہوئی تھی پھر اُس نے بابے خیرے سے نظریں ملائیں جن میں التجا تھی۔

ڈیرے پر موجود سب افراد کی نظریں چودھری ریاست پر مرکوز تھیں سب کی سانسیں ساکن تھیں۔ سب جانتے تھے جو بات چودھری ریاست کہے گا وہ حتمی ہو گی۔ چودھری ریاست نے سارے مجمعے پر نظر دوڑائی، ایک لمحے سوچا پھر بول اُٹھا:

''تایا جی! وہ بھینس میری بہن نے اپنے جہیز کے لیے پسند کر رکھی تھی اِس لیے چودھری جہانگیر کو خالی ہاتھ بھیج دیا۔ اب میں وہی بھینس.....مولوی صادق کو اُس کی بہادری کے انعام میں تحفہ دیتا ہوں۔'' ڈیرے پر موجود سب لوگ یہ سن کر خوشی سے جھوم اُٹھے اور ستائشی نظروں سے چودھری ریاست کو دیکھنے لگے۔ سودے نائی نے تو اُٹھ کر چودھری ریاست کے لیے نعرہ بھی لگا دیا۔

''ایک بھینس میری طرف سے بھی۔ مولوی صادق کو اُس کی بہادری کا انعام۔'' بڑے چودھری نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

بابے خیرے نے بڑے چودھری کی طرف دیکھا اُس کے بعد مشکور نگاہ چودھری ریاست پر ڈالی پھر کہنے لگا:

''مولوی صادق! ہر بار چوری پر انعام نہیں ملتا.....آگے سے کسی کی بھی..... بہادری میں بھی.....

''کُنڈی نہ کھولنا۔''

❁ ❁

تقریباً پونے گیارہ بجے

''جہاں خیر نہیں ہوتا وہاں شر ہوتا ہے اور جہاں لنگر نہ ہو وہاں بھوک ہوتی ہے۔ آپ اگر لنگر کو ختم کرو گے تو بھوک دنیا کا سب سے بڑا مذہب بن جائے گی، بھوک ہاتھی کو بندر بنا دیتی ہے اور انسان کو حیوان۔ اللہ کی شان دیکھیں چوہان صاحب...! فقیر کے دَر سے لنگر ملتا ہے اور وقت کے حکمرانوں کے دَر سے دھکے۔''

''کیا یہ وہی لنگر ہے جو صوفیا کی خانقاہوں پر ملتا تھا؟'' میں نے پانی کی طرح پتلی دال اور ربڑ کی طرح سخت روٹی کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا۔ میاں لطفی کے چہرے پر میٹھی مسکراہٹ اُبھری۔

''چوہان صاحب...! آپ اسے لنگر مت کہیں کوئی دوسرا نام دے دیں۔ آپ نے کبھی بغیر جانے، بغیر پوچھے دس لوگوں کو کھانا کھلایا ہے؟''

میں نے نفی میں گردن ہلا دی تھی۔

''یہاں پر لاکھوں لوگ روزانہ کھاتے ہیں۔ کوئی کھلانے والا کسی کا نام نہیں پوچھتا... معاف کیجیے گا...! آپ جیسے لوگ گھرانہ دیکھ کر کھانا بھجواتے ہیں۔'' میاں لطفی نے سانس لی تو میں فوراً بول پڑا:

''کیا؟ آپ اپنے گھر میں اسی طرح کا کھانا اپنے بچوں کو کھلاتے ہیں؟''

''چوہان صاحب...! آپ کو بھی یورپ والوں کی طرح اسلام کی خوبیاں نظر نہیں آ رہی ہیں۔ دنیا کے کسی حصے میں لنگر جیسا کوئی سسٹم ہو تو بتائیں یورپ، امریکا کی کوئی حکومت روزانہ چوبیس گھنٹے لاکھوں لوگوں کو مفت کھانا کھلاتی ہو۔ کوئی ادارہ این جی او وغیرہ۔ آپ کو ایک بھی ایسا صاحبِ حیثیت آدمی نہیں ملے گا۔ لنگر خدائی دسترخوان ہے جو اولیاء اللہ کی درگاہوں پر ہی بچھتا ہے۔ اولیاء اللہ ہی اسلام کے صحیح نمائندے ہیں۔ آپ اور وہ یورپ والے چند خارجی ذہنوں کو اسلام کے نمائندے بنا کر پیش کرتے ہیں۔''

''میاں صاحب...! میں لنگر کی کوالٹی کی بات کر رہا تھا۔ آپ نے مجھے بھی یورپ والوں کے ساتھ ملا دیا ہے۔''

''کسی بھی چیز کی کوالٹی کو بہتر بنانے کے لیے وقت اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ محنت کرنے کے لیے وقت ہمارے پاس نہیں ہے۔ بڑے کھاتے پیتے حضرات باہر ہی سے لنگر کے لیے پیسے دے کر چلے جاتے ہیں۔ اُن کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ دیکھ لیں جو رقم انھوں نے لنگر کے لیے دی ہے کھانا اُسی معیار کا ہے۔ پہلے لوگ اپنے گھروں سے کھانا لا کر درگاہوں پر تقسیم کرتے تھے۔ وہ اسپیشل کھانا

ہوتا تھا۔ ایسا کھانا لوگ اپنے گھروں میں بھی نہیں کھاتے تھے جیسا وہ لوگ درگاہوں، مزاروں پر تقسیم کرتے تھے۔ اب بھی کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں مگر ایسا کرنے والوں کی تعداد کم ہوگئی ہے۔ آپ کی نظر جس پتلی دال اور روٹی پر لگی ہوئی ہے وہ تو اپنا روزگار کما رہا ہے۔ یہاں سو کے قریب لنگر خانے قائم ہیں جو یہ کاروبار سالوں سے کر رہے ہیں، یہ لوگ اللہ کی مخلوق کو کچھ نہ کچھ کھلا کر ہی کماتے ہیں۔ ہمارے پاکستان میں تو لوگوں کے منہ سے نوالہ چھین کر کمانے کا فیشن چل پڑا ہے۔''

اچانک میاں لطفی کے موبائل پر نعتیہ کلام لگ گیا کسی نے کال کی تھی۔ میاں لطفی بات کرنے میں مصروف ہوگئے۔

''لنگر والے... لنگر والے... آجاؤ... لنگر والے'' آواز بلند ہوئی تھی۔ میری نظروں نے آواز کا پیچھا کیا تھا، میں کیا دیکھتا ہوں، لنچ کے ڈسپوزیبل باکس ایک عورت تقسیم کر رہی تھی۔ میں نے ایک نظر میاں لطفی پر ڈالی۔ وہ بات کرتے ہوئے میری طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے مجھے اشارہ کیا ایک باکس لینے کے لیے۔ میری اُنا کا بت لنگر لینے کے لیے تیار نہیں تھا پھر بھی میں چند قدم آگے بڑھ گیا۔ چالیس پچاس لوگ وہ باکس لے کر دائیں بائیں کھڑے بیٹھے کھانے میں مصروف تھے۔ اُس عمر رسیدہ خاتون نے شاید میری آنکھوں کی تحریر پڑھ لی تھی۔ اُس نے ایک مزدور کے ہاتھ ایک لنچ باکس مجھے بھی بھیجا تھا۔ میں نے وہ باکس تھام لیا۔

''چوہان صاحب...! بھولے کی دُکان پر بیٹھ کر کھائیں۔ مجھے تھوڑا کام ہے۔ ان شاءاللہ دوبارہ ملاقات ہوگی۔'' میاں لطفی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ وہ مجھے بھولے کے حوالے کر گئے تھے۔ میں لکڑی کے ایک بینچ پر بیٹھ گیا تھا اور میں نے وہ لنچ باکس کھولا۔ قیمے والے چاول تھے اوپر دو شامی کباب۔ ساتھ تھوڑا سا حلوہ۔ میں ان دنوں وزن کم کرنے کے چکر میں ڈائٹنگ کر رہا تھا، چاول اور میٹھا دونوں ہی میرے پرہیز میں شامل تھے۔ میں نے کھانے کی کوالٹی چیک کرنے کی غرض سے ایک نوالہ منہ میں ڈالا۔ ڈائٹنگ گئی بھاڑ میں۔ ایسے ٹیسٹی قیمے والے چاول میں نے پوری زندگی میں نہیں کھائے تھے۔ چاول کھانے کے دوران میں نے بھولے کو رسماً صلح ماری تھی۔ بھولا بولا:

''باؤ جی...! آپ کھاؤ، میں بچپن سے کھا رہا ہوں۔''

میں نے پورا باکس ختم کر کے ہی گردن اٹھائی تھی۔ جیسے ہی میں نے کھانا ختم کیا ایک لڑکا دو کپ اور تھرماس تھامے ہوئے وارد ہوا تھا۔

''بھولے...! ابا جی نے مہمان اور تمھارے لیے چائے بھیجی ہے۔'' اُس لڑکے نے تھرماس اور کپ رکھتے ہوئے کہا۔

بھولا دو عورتوں کو پھول اور مکھانوں کا پیکٹ دے رہا تھا۔ بھولے نے مجھے چائے ڈال کر پیش کی۔ میں نے پہلا گھونٹ لیا۔

''واہ...!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ویسی چائے بھی میں نے کم ہی پی تھی۔ بھولے نے مجھے بتایا:

''میاں لطفی کے شوق بھی نرالے ہیں۔ یہاں پر آنے والے زائرین کی خدمت کرتے ہیں۔ لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں خود اپنے ہاتھوں سے۔ چائے اور پان کے شوقین ہیں۔ نماز کے وقت اُن کے منہ میں پان نہیں ہوتا یا پھر چائے پینے کے دوران۔

لنگر کے متعلق بتانے والا تو وہاں نہیں تھا۔ مجھے دو طرح کا کھانا کھا کر لنگر کی سمجھ آ گئی تھی۔ قیمے والے چاول کھانے سے پہلے میں نے پتلی دال اور ربڑ کی طرح سخت روٹی بھی کھائی تھی۔ سچ کہوں تو دال روٹی کا بھی اپنا ہی مزہ تھا۔ میں اپنی چائے ختم کر چکا تھا۔ بھولے نے مجھے کہا:

''باؤ جی...! آپ بیٹھو، میں نماز پڑھ کر آیا۔'' وہ یہ بول کر وہاں سے چلا گیا، اُس نے مجھے نماز کی دعوت نہیں دی، میں بھی ہفتہ وار نمازی تھا۔ اس میں بھی اللہ جھوٹ نہ بلوائے، ڈنڈی مار لیتا، بھولا بھی اولیاء اللہ کے طریقے پر تھا۔ اُس نے بھی تلقین کی بجائے عمل کا رستہ چنا۔

بھولا نماز پڑھ کر آیا تو میں بھی اس کی دکان اُس کے حوالے کر کے نماز پڑھنے چلا گیا، عصر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں بھولے کے پاس آیا تو وہاں پر گاہکوں کا رش لگا ہوا تھا۔ جمعرات کا دن تھا۔ کوئی پھول خرید رہا تھا، کوئی مکھانے تو کوئی اگربتی۔ بھولا اپنی دکان داری بھی کر رہا تھا اور مجھ سے باتیں بھی۔ بھولے کی اپنی کہانی بھی بڑی دل چسپ تھی اس نے مجھے بتایا:

''باؤ جی...! میں نے ہوش سنبھالا تو داتا کی نگری میں تھا۔ اِن ہی گلیوں میں میرا بچپن گزرا ہے۔'' بھولے نے روشن آنکھوں سے گلی کی طرف اشارہ کیا تھا فخریہ انداز میں۔

''باؤ جی...! آپ میاں صاحب سے لنگر کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں نے ساری زندگی یہی لنگر کھایا ہے اور اسی کے سہارے زندگی کو بچایا ہے۔ مجھے نہیں پتا میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں، میرے ماں باپ کون ہیں، بھوک لگتی تو لنگر کھا لیتا۔ اُداس ہوتا تو حضور داتا صاحب کے سامنے جا کر بیٹھ جاتا پھر ایک دن میاں لطفی صاحب کی نظر مجھ پر پڑی۔ انھوں نے مجھے نئے کپڑے لا کر دیے۔ تھوڑا بڑا ہوا تو مجھے پھولوں کا کام شروع کرنے کے لیے روپے بھی دیے۔ پھر میری شادی بھی کروائی۔ اب میرے دو بیٹے ہیں، عاطف اور ثاقب۔ اپنا چھوٹا سا گھر بھی ہے۔ اللہ نے بڑا کچھ دیا ہے حضور داتا صاحب کے صدقے۔''

''بھولے...! تمھیں نہیں لگتا داتا کہنا غلط ہے؟'' میں نے جھجکتے جھجکتے پوچھ ہی لیا تھا۔ بھولا مسکرایا اور کہنے لگا:

''باؤ جی...! آپ پڑھے لکھے لوگ بھی بھولے ہی ہوتے ہیں۔ میں پڑھا لکھا تو نہیں ہوں پھر بھی اتنا تو مجھے بھی پتا ہے ''داتا'' دینے والے کو کہتے ہیں۔ ہر دینے والا خدا نہیں ہوتا۔ ہاں...! سب کچھ دینے والے کو اللہ کہتے ہیں۔ ابھی وہ عورت لوگوں کو کھانا دے کر گئی ہے تو کیا وہ داتا نہیں؟ ابھی آپ نماز پڑھ کر آئے ہیں، آپ نے دیکھا ہو گا داتا صاحب کے روضے کی طرف کوئی کنڈ (پشت) نہیں کرتا۔ ہم مغرب کی نماز پڑھنے چلیں گے جب جماعت کھڑی ہو گی تو ہزاروں لوگوں کی کنڈ حضور داتا صاحب کی طرف ہو جائے گی۔ سیدھی بات ہے باؤ جی...! جب داتا کے ساتھ صاحب لگ جائے تو کاہے کا داتا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی ہم لوگوں نے اولیاء اللہ کو بھی نہیں بخشا اپنی دکانداری چلانے کے لیے کچھ ان کا نام بیچتے ہیں اور کچھ اولیاء اللہ کے اوپر اپنی تنقید کو بیچتے ہیں۔ باؤ جی...! نماز ادب سکھاتی ہے۔ ہم نماز پڑھنے کے دوران کسی داتا صاحب کا ادب نہیں کرتے صرف اور صرف اپنے اور حضور داتا صاحب کے اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔''

میں بھولے سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر اس کا جذباتی انداز دیکھ کر خاموش ہو گیا تھا۔ میں کسی فرقے کا پرچار نہیں کر رہا۔ جو کچھ بھولے سے سنا ایمان داری سے لکھ دیا۔ ہاں...! ایک بات بھولے نے کمال کی، کی تھی۔ نماز کے دوران کوئی بھی شخص یہ نہیں سوچتا کہ اس کی پشت عظیم صوفی بزرگ ابوالحسن علی بن عثمان الہجویری رحمۃ اللہ علیہ المعروف داتا صاحب کی طرف ہو رہی ہے۔ شاید یہی توحید ہے۔ اللہ کے سامنے کوئی داتا نہیں۔ کوئی صاحب نہیں۔ سب کے سب فقیر، منگتے، سوالی محتاج، عاجز، بے بس اس کے بندے ہیں۔

اُس دن یکم جولائی بروز جمعرات 2010ء تھا۔ میں نے اور بھولے نے مغرب کی نماز اکٹھے ادا کی۔ اُس کے بعد میں شادباغ لوٹ گیا کیوں کہ مجھے ایئر پورٹ پہنچنا تھا دبئی جانے کے لیے۔ رات ساڑھے بارہ بجے میری دبئی کی فلائیٹ تھی۔

داتا صاحب سے جاتے ہوئے رکشا میں سوار ہونے سے پہلے میں نے مڑ کر دیکھا تو میری نظر خواجہ معین الدین چشتیؒ کے شعر پر جا کر ٹھہری...

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا

ناقصاں راپیرِ کامل کاملاں را رہنما

بورڈنگ کے بعد میں ویٹنگ ہال میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک مشہور ٹی وی چینل یہ خبر دے رہا تھا:

"یہ آپ دیکھ سکتے ہیں پہلے ایک حملہ آور جس کا میٹل ڈیٹیکٹ ہوا سیکیورٹی اہلکار اور رضا کار نے اسے پکڑنا چاہا تو وہ اندر کی طرف بھاگا۔ اس سے پہلے وہ اسے پکڑتے حملہ آور نے وضو خانے میں پہنچ کر خود کو دھماکے سے اڑا لیا۔ یہ دھماکا 10 بج کر 48 منٹ پر ہوا تھا۔ جب لوگ اس دھماکے کے بعد باہر بھاگ رہے تھے تو اسی گیٹ سے ایک اور خودکش حملہ آور اندر داخل ہوا جس کے ہاتھ میں بیگ تھا۔ اس نے دربار کے احاطے میں پہنچ کر ٹھیک 10 بج کر 53 منٹ پر دوسرا دھماکا کر دیا۔ ان دھماکوں میں چالیس افراد شہید اور ایک سو پچھتر زخمی ہوئے۔

"داتا صاحب کے دربار پر دھماکے؟" میں نے خود سے پوچھا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے اِس ملک میں؟'

!!!I am deeply shocked too!!

!!!It is sad to know!!

!!How sad!!

"یا اللہ...! اس ملک کو دشمنوں سے محفوظ رکھ۔"

"یہ ملک رہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔"

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ...جس ملک میں مسجدیں، درگاہیں، امام بارگاہیں ہی محفوظ نہ ہوں اُس ملک کا اللہ ہی حافظ ہے۔''

LCD کے اردگرد جمع لوگ افسوس کا اظہار کررہے تھے۔ جہاز میں سارے رستے عجیب سی طبیعت رہی۔ دبئی پہنچا اگلے دن دیر تک سوتا رہا پھر وہی دنیا کے دھندے جھمیلے۔ سچی بات ہے کبھی اُن دھماکوں کا خیال ہی نہیں آیا۔ چند ہفتوں بعد لنگر کے نام سے ایک افسانہ لکھنا شروع کیا تھا۔ وہ مکمل نہ ہوسکا پھر سوچا اس کا نام بھولا پھول والا رکھ دوں۔ نام بدل کر بھی کہانی مکمل نہ کرسکا تھا۔ وہ ادھوری کہانی کاغذ کے پنوں کے قبرستان میں کہیں دفن ہوگئی تھی۔

(آج پانچ سال چار مہینے اور چار دن بعد یعنی پانچ نومبر بروز جمعرات 2015ء کو لنگر اور بھولا پھول والا میرے سامنے کاغذ کے سینے پر درج ہیں۔ آج اتنے سالوں بعد میں رات نو بجے کے قریب داتا صاحب پہنچا ہوں۔ اتنے عرصے کے بعد بھی ان دھماکوں کے اثرات اب بھی باقی ہیں۔ پہلے کی نسبت سیکورٹی بہت زیادہ ہے۔ حفاظتی اقدامات کے پیشِ نظر بہت سارے بیریئر اور جنگلے لگادیے گئے ہیں)

میں نے سوچا پہلے سلام کر آتا ہوں اس کے بعد بھولے اور میاں لطفی سے ملوں گا۔ میں تلاش کررہا تھا کسی عینی شاہد کو جو ان دھماکوں کے وقت وہاں موجود ہو۔ میں حضور داتا صاحب کی درگاہ پر سلام کرکے آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک آواز نے میرے قدم روک لیے۔

ایک صاحب سفید شلوار قمیض میں ملبوس، گلے میں گلاب اور گیندے کے پھولوں کا ہار، بائیں ہاتھ میں بڑی سی تسبیح، ہونٹوں پر میٹھا سا تبسم، آنکھوں میں چمک اور آواز میں ٹھہراؤ داتا صاحب کے مزار کے ایک ستون کے ساتھ بڑے پُرسکون انداز میں ٹیک لگائے ہوئے دو اسٹوڈنٹس کو پنجابی کے اشعار لکھوا رہے تھے۔ میں نے اجازت لی اور میں بھی ان کی مجلس میں بیٹھ گیا، وہ صاحب کافی دیر ان لڑکوں سے بات کرتے رہے۔ اس کے بعد میری باری آئی، میں نے اپنا تعارف کروایا، ان صاحب نے مجھے بتایا اس دن وہ اسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے جب دھماکے ہوئے تھے۔ ان کے بقول شہید ہونے والوں کی تعداد سرکاری اعداد و شمار کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی اور زخمیوں کی صورتِ حال بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔

وہ صاحب مشہور فلم ساز محمد سرور بھٹی تھے جنھوں نے مولا جٹ فلم بنائی تھی۔ انھوں نے کہا:

''مولا تو مولا ہی ہے۔ ایک انسان مولا جٹ تو ہوسکتا ہے، مگر ایک جٹ کبھی بھی مولا نہیں بن سکتا۔ نوری نت ''نہیں'' کی لت میں مبتلا تھا، مولا جٹ ماننے والوں کی جگہ پر کھڑا تھا، جو اپنے مولا کی مان لیتا ہے وہ اُسے مولا جٹ بنا دیتا ہے۔ مولا کی نا ماننے والے نور ہوتے ہوئے بھی بے نور ہوجاتے ہیں جیسے نوری نت۔ چوہان صاحب...! مولا جٹ اچھائی کا نام ہے اور نوری نت بُرائی کی علامت۔''

محمد سرور بھٹی کی بات سن کر میرا دل چاہا بھولے سے دوبارہ ملوں۔ میں نے بھٹی صاحب سے اجازت لی اور درگاہ سے نکل آیا۔ تھوڑی دیر بعد میں مزار کے دائیں طرف والے بازار میں تھا اور بھولے کی دکان تلاش کررہا تھا۔ تھوڑی مشقت کے بعد مجھے بھولے کی دکان مل گئی۔

بھولے کی بجائے ایک تیرہ چودہ سال کا لڑکا دکان پر بیٹھا تھا۔میں نے سوچا اس کا بیٹا ہوگا۔

''لنگر والے...لنگر والے...''

دونو جوان لڑکے تھے۔انھوں نے ایک بڑا سا تھیلا پکڑا ہوا تھا جس میں سے وہ شاپر بیگ نکال نکال کر تقسیم کر رہے تھے۔میں نے بھی بڑھ کر ایک شاپر بیگ پکڑ لیا،اس کے اندر چکن بریانی تھی۔میں نے اپنا شولڈر بیگ ایک طرف رکھا اور کھڑے ہو کر بائیں ہاتھ میں ہتھیلی کے اوپر شاپر بیگ رکھا اور دائیں ہاتھ سے کھانا شروع کر دیا،میں بریانی کھانے میں مصروف تھا کہ ایک ہاتھ میرے کندھے پر آیا۔

''چوہان صاحب...!لنگر کھا رہے ہیں۔''

میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔میاں لطفی منہ میں پان ڈالے ہوئے بول رہے تھے۔

''آپ نے مجھے پہچان لیا اتنے سالوں بعد بھی؟''میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''چوہان صاحب...!کون سی صدیوں کی بات ہے۔پانچ سال چار ماہ اور چار دن ہی ہوئے ہیں۔''

''آپ یہاں اس وقت؟''میں نے عجیب سا سوال پوچھ لیا تھا۔میاں لطفی مسکرائے اور بولے:

''چوہان صاحب...!دوسری گلی میں میرا گھر ہے۔ہم نے کہاں جانا ہے۔(جینا یہاں،مرنا یہاں،اس کے سوا جانا کہاں)''

میاں لطفی نے مکیش کا گانا گنگنایا۔اس کے بعد وہ مجھے بڑی محبت سے اپنے گھر لے گئے۔انھوں نے مجھے اپنی بیٹھک میں بٹھایا اور خود اندر چلے گئے۔بیٹھک کی ایک دیوار کے ساتھ کتابوں کی ایک لائبریری تھی جس میں صحاحِ ستہ کی ساری حدیثیں اور بہت سارے اولیاء کرام کی تصانیف موجود تھیں۔دوسری دیوار کے اوپر بیت اللہ اور گنبدِ خضریٰ کے نیچے بہت سارے اولیاء کرام کے مزارات کی تصویریں فریموں میں سجی ہوئی آویزاں تھیں۔بیٹھک سے بھینی بھینی خوش بو آ رہی تھی۔گھر تو پرانے عہد کا تھا۔پھر بھی اچھی طرح سے رکھا گیا تھا۔تھوڑی دیر بعد میاں لطفی ٹرے میں دو کپ چائے لے کر بیٹھک میں داخل ہوئے:

''چوہان صاحب...!یہ لیں چائے۔میں نے خود بنائی ہے اپنے ہاتھوں سے۔''

اس وقت میاں لطفی کے منہ میں پان نہیں تھا۔وہ کلی کر کے آئے تھے۔مجھے بھولا یاد آ گیا اس نے کہا تھا:

''نماز کے وقت ان کے منہ میں پان نہیں ہوتا یا پھر چائے پینے کے دوران۔''

میں نے چائے کا گھونٹ لیا۔وہی ذائقہ،وہی خوش بو جو پانچ سال پہلے تھی۔

''آج بھولا نظر نہیں آیا بازار میں؟''میں نے چائے پینے کے دوران پوچھا۔میاں لطفی نے میری طرف دیکھا پھر سنجیدگی سے کہنے لگے:

''آپ چائے ختم کر لیں پھر بتاتا ہوں۔''

میں نے چائے ختم کی اور پرچ کپ میز پر رکھا اور میاں لطفی کی طرف متوجہ ہوا۔ میاں لطفی کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ پرچ اور کپ ان کے ہاتھ میں تھا۔ میں گرم گرم چائے پینے کا عادی ہوں۔ میں نے سوچا شاید میں نے جلدی چائے ختم کر لی ہے۔ میں کافی دیر میاں لطفی کو دیکھتا رہا انھوں نے چائے کا ایک بھی گھونٹ نہیں لیا، مجھے کچھ تشویش سی ہوئی تھی۔

''میاں صاحب...! میاں صاحب...!''

''جی...جی...'' انھوں نے بوکھلاہٹ میں جواب دیا۔

''کہاں کھو گئے ہیں آپ؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں کچھ نہیں۔'' انھوں نے پرچ اور کپ میز پر رکھا اور خود واش روم میں چلے گئے۔ میں نے دیکھا کپ چائے سے آدھا بھرا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میاں لطفی واپس آئے تو انھوں نے تولیے سے منہ صاف کیا اور اسے کرسی کی پشت پر ڈال دیا تھا اور بیٹھتے ہوئے بولے:

''چوہان صاحب...! میں آپ کا چہرہ ساری عمر نہیں بھول سکتا تھا۔ جس دن آپ لنگر کے بارے میں پوچھ رہے تھے اسی رات وضو خانے سے پہلے لنگر خانے میں دھماکا ہوا تھا۔ اس کے بعد اوپر حضور داتا صاحب کے روضے اور مسجد کی سیڑھیوں کے درمیان دوسرا دھماکا ہوا تھا۔ مجھے دھماکوں کے دوسرے دن خیال آیا شاید آپ بھی ان لوگوں کی پلاننگ میں شامل تھے۔ میرا دماغ مجھے یہ کہہ رہا تھا مگر دل نہیں مانتا تھا۔ پہلے بھی میں بازار میں ہی گھومتا رہتا تھا۔ اب صرف نماز کے اوقات میں رکتا ہوں۔ نہیں تو گشت کرتے رہتا ہوں دربار کے چاروں اطراف۔ آج آپ جب درگاہ میں جانے کے لیے لائن میں لگے تھے تو پولیس والے نے آپ سے کہا تھا:

''آپ یہ بیگ اندر نہیں لے جا سکتے ہیں۔''

آپ نے جواب دیا: ''اس میں کتابیں اور کچھ کاغذات ہیں۔''

پولیس والا بولا: ''جو بھی ہے یہ اندر نہیں جا سکتا۔ آپ بیگ کو اس دکان پر جمع کروا دیں۔''

آپ مسکراتے ہوئے فوراً مان گئے پھر آپ نے وہ بیگ رشید کی دکان پر جمع کروا دیا، میں نے ایک لڑکے کی ڈیوٹی لگائی کہ اس بیگ کی اچھی طرح سے تلاشی لے۔ میں آپ کے پیچھے ہی تھا۔ آپ کو خبر نہیں ہوئی پھر آپ نے آنکھیں بند کر کے حضور کو سلام پیش کیا۔ اس کے بعد دعا کی۔ پھر آپ نے اردگرد کا جائزہ لیا اور محمد سرور بھٹی کے پاس بیٹھ گئے۔ آپ بھٹی صاحب سے اُن دھماکوں کے متعلق پوچھنا شروع ہو گئے۔

میں نے دوسرے آدمی کی ڈیوٹی لگائی کہ آپ پر نظر رکھے۔ خود واپس رشید کی دکان پر گیا جہاں آپ نے اپنا یہ والا بیگ رکھا تھا۔ میں خود اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے اندر بہت سارے کاغذات تھے۔ ایک دو ڈائریاں تھیں اور ایک ناول بلال صاحب بھی تھا۔

میں نے اسے کھولا صفحہ نمبر 51 کھل گیا۔ میں نے پڑھا ایک لائن مجھے بہت اچھی لگی تھی۔

”اقبال سے بہت بلند اقبال کا اقبال ہے اور اقبال سے بھی بلند بلال کا اقبال ہے۔“

پھر میں نے چند صفحے اور پلٹے تو صفحہ نمبر 102 پر لکھا ہوا تھا:

”بلال کا مطلب ہے عشق............عشق کا مطلب ہے بلال۔“

چوہان صاحب...! سچ کہوں تو آپ کو آپ کے ناول بلال صاحب نے بچا لیا نہیں تو میں پولیس کو فون کرنے لگا تھا۔“

میاں لطفی کی بات سن کر میرے طوطے اڑ گئے تھے۔

”میں آپ کو سمجھ نہیں پایا آپ کون ہیں؟ اور کیا کرتے ہیں کہیں آپ کسی سیکرٹ ایجنسی...“

”نہیں...نہیں...میرے بزرگ صدیوں سے یہاں آباد تھے۔ درگاہ کے ساتھ والے بازار کی بیشتر دکانیں میری ہیں۔ میرے بچے شہر کے پوش علاقوں میں شفٹ ہو گئے۔ بیوی فوت ہو چکی ہے۔ میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔“ میاں لطفی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ پھر کافی دیر خاموش رہے دوبارہ بولے:

”چوہان صاحب...! میں نے دھماکوں سے پہلے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ یہاں بھی دھماکے کر سکتے ہیں۔ اس حادثے کے بعد سے سیکیورٹی بڑھ گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اور میرے چند ساتھی دربار کے اردگرد گھومتے رہتے ہیں اور ہماری ہر آنے جانے والے پر نظر ہوتی ہے۔“

میاں لطفی کی آنکھوں میں پہلی بار میں نے نمی دیکھی تھی۔ انھوں نے پان باکس سے ایک پان نکالا اور منہ میں ڈال لیا۔ اپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کو سر کے بالوں سے صاف کیا۔

”میاں صاحب...! میں اجازت چاہوں گا۔“ میں نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

”بھولا کہاں ملے گا؟“

میاں لطفی نے گھڑی پر وقت دیکھا۔ پونے گیارہ بجنے والے تھے۔

”آپ آئیں میرے ساتھ!“

میں میاں لطفی کے پیچھے چل دیا۔ بازار سے گزرتے ہوئے میں نے بہت سارے غریبوں کو کھانا کھاتے دیکھا تھا۔ میرا ایک دوست کہتا ہے:

”درگاہوں کے اردگرد جرائم پلتا ہے۔“

جرائم پلتا ہوا تو میں نے نہیں دیکھا تھا۔ ابھی تو میں دربار کے گردونواح میں غریبوں کو پلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میں میاں لطفی کے پیچھے چلتا ہوا دربار اور مسجد کے درمیان واقع صحن میں پہنچ گیا، وہاں دُعا ہو رہی تھی۔ آہیں اور سسکیاں بلند تھیں۔ آنسو نکل رہے تھے۔ داتا

صاحب کے ماننے والے عقیدت مند رو رو کر اپنے اور داتا صاحب کے اللہ سے مانگ رہے تھے۔

دعا ختم ہوئی تو لنگر تقسیم ہونا شروع ہو گیا، کہیں قیمے والے نان، کہیں مٹھائی، کہیں ٹافیاں۔ بے شمار چیزیں کھانے کو اور دیکھنے کو ملی تھیں۔ لنگر کے متعلق تو مجھے سارے جواب مل گئے تھے۔ جس طرح ہم لوگ اپنے اپنے گھروں میں کبھی چٹنی سے روٹی کھا لیتے ہیں اور کبھی گھی شکر سے کبھی لسی کی کڑھی سے کام چلایا جاتا ہے اور کبھی بکرے کا گوشت ہمارے دستر خوان پر ہوتا ہے۔

لوگوں کا رش کافی حد تک کم ہو چکا تھا۔ مجھے بھولا کہیں نظر نہیں آیا۔ میں یہ سوچ رہا تھا وہ بھی دُعا میں ہو گا مگر نہیں... نظر نہیں آیا۔

اس سے پہلے کہ میں میاں لطفی سے بھولے کے متعلق پوچھتا۔ میاں لطفی ایک جگہ بیٹھتے ہوئے بولے:

"چوہان صاحب...! یکم جولائی آج ہی کے دن 2010ء کو دوسرا دھما کا وہاں ہوا تھا۔ تقریباً پونے گیارہ بجے۔ ٹھیک گیارہ بجے میں یہاں پہنچا تھا اور اس جگہ بھولے کا سر پڑا ہوا تھا۔"

میاں لطفی نے اس سفید ماربل پر ہاتھ پھیرا جہاں ان کے بقول بھولے پھول والے کا سر پڑا ہوا تھا۔ وہ گردن جھکائے ہوئے تھے اسی جگہ۔ ان کی آنکھوں سے آنسو گرنا شروع ہو گئے۔

"چوہان صاحب...! مجھے صرف بھولے کا سر ملا تھا، دھڑ کا پتا نہیں۔ تقریباً پونے گیارہ بجے سینکڑوں دوسرے شہداء کے ساتھ ساتھ بھولے کو بھی شہادت نصیب ہوئی تھی۔

تقریباً پونے گیارہ بجے۔"

حرا کا حجاب

"ہر فکر کے پیچھے ایک حرا ہوتی ہے۔"

"پتا ہے امی جی...! ہر فکر کے پیچھے ایک حرا ہوتی ہے۔ ہر جلوت کے پیچھے ایک خلوت ہے۔ طاقت کا سرچشمہ علم ہے۔ عیاں کو بیان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ چار سنہری اُصول میرے دادا محمد جمیل شاہ نے میرے باپ محمد نوید شاہ کو سکھائے تھے اور ابو کے انتقال کے بعد یہ آپ کی ڈیوٹی ٹھہری۔"

حرا نوید شاہ نے چڑتے ہوئے اپنی ماں شگفتہ بانو کو جواب دیا۔

"حرا بیٹی...! یاد تو میں کراتی ہوں تجھے غصہ کیوں آتا ہے...؟" شگفتہ نے رات کی باسی روٹی اور چائے کا کپ اپنے جہیز کے میز پر رکھا تھا۔

"چلو ناشتہ کر لو کالج سے دیر ہو رہی ہے۔"

حرا نے نوالہ منہ میں ڈالا اور گرم چائے کا گھونٹ لیا۔ گرم چائے نے زبان کو حرارت پہنچائی اور دل کے شکوے زبان پر آ ہی گئے۔ دادا کہتے تھے:

"ہر فکر کے پیچھے حرا ہوتی ہے" اور یہاں حرا کے آگے پیچھے غربت ہے، جلوت کا تو پتا نہیں۔ یہاں تو خلوت ہی خلوت ہے۔ ہمیں کوئی رشتہ دار بلاتا نہیں اور خود ہماری طرف آتا نہیں۔ عیاں کو بیان کی ضرورت نہیں۔ یہ خوب کہا تھا دادا جی نے ہماری غربت سب پر عیاں ہے۔ مجال ہے کوئی بیان کے بغیر سمجھ جائے...

تیسرا سنہری اُصول تو بھول ہی گئی، طاقت کا سرچشمہ علم ہے۔ علم پڑھ پڑھ کر مجھے چشمہ لگ گیا، طاقت نہیں ملی۔"

"حرا بیٹی...! تو ایسی بے ادبی کی باتیں مت کیا کر...!" شگفتہ نے شفقت سے حرا کے بازو پر ہاتھ رکھا جو کہ اُس کے سامنے ہی بیٹھی تھی۔

"امی جی...! کسی کے سامنے اپنی غربت کا رونا رونے سے بہتر ہے اُس سے شکوہ کر لو جس کے سامنے سب کچھ ہے۔"

"پچھلے کچھ عرصے سے جو کام تم نے شروع کیا ہوا ہے، اُسے چھوڑ دو بیٹی...! ہم سیّد ہیں... اپنے خاندانی رُتبے کا ہی خیال کر لو۔"

شگفتہ نے حرا کو اُس کا مقام اور کام دونوں کی یاد دہانی کروائی، اُسے ڈر تھا بے عزتی کا رسوائی کا۔

''اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی چھوٹی چھوٹی خواہشیں ہی پوری کر رہی ہوں۔اس سے کسی کا کوئی نقصان تو نہیں ہوتا،اگر کچھ گناہ ہے بھی تو وہ صرف میری ذات پر ہے۔'' حرا نے اپنا بیگ پکڑا اور علامہ اقبال میڈیکل کالج کو روانہ ہوگئی۔

حرا علامہ اقبال میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس کے فائنل ائیر کی اسٹوڈنٹ تھی۔حرا نوید چار بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ بچپن میں ہی اس کا باپ ایک ایکسیڈینٹ میں فوت ہوگیا،ماں سلائی کا کام جانتی تھی۔اپنے جہیز کی سلائی مشین نکالی اور زندگی کا پہیہ چل پڑا۔

حرا شروع ہی سے پڑھنے میں لائق تھی،حرا نے اپنی حسرتوں کا رس نچوڑ نچوڑ کر اپنے قلم میں سیاہی ڈالی...چھوٹے بہن بھائی بھی اُس کی دیکھا دیکھی قناعت شعار،پڑھنے میں لائق اور روشن ضمیر بنتے گئے شگفتہ کو زیادہ سر کھپانا نہیں پڑا اپنے بچوں کے ساتھ اِن تمام خوبیوں کے باوجود وہ تھے تو بچے ہی۔اُن کی کچھ معصوم سی آرزویں ہوتی جو حرا پوری کر دیتی تھی۔حالاں کہ اُسے وہ سب کچھ کرنا قطعی پسند نہیں تھا،پھر بھی وہ کر رہی تھی۔

حرا اپنی کلاس میں حجاب کرتی تھی،چہرے پر نقاب ہوتا اور پورے جسم پر برقعہ۔بارہ مہینے پاؤں میں جوگر شوز پہنتی۔کسی نے پوچھا ایسا کیوں...؟ حرا بولی: میرے پیروں میں درد رہتا ہے ڈاکٹر نے سجیسٹ کیا تھا۔کندھے پر لیدر کا ایک کالا بیگ ہوتا جو کہ اُس نے ٹاؤن شپ کی لنڈا مارکیٹ سے خریدا تھا۔

کالج پیدل جاتی،وجہ کالج اُس کے گھر کے پاس ہی تھا۔وہ (شاہ دی کھوئی) کی مکین تھی۔اپنی کلاس میں سب سے الگ تھلگ رہتی۔کوئی دوست نہیں تھا اُس کا۔اپنی کلاس کی سب سے لائق اسٹوڈنٹ تھی۔کالج میں فارغ وقت جناح ہسپتال اور علامہ اقبال میڈیکل کالج کے OVAL گراؤنڈ کے درمیان واقع کینٹین جو کہ شاہین مال کے نام سے مشہور تھی وہاں پائی جاتی مگر اکیلی۔ہاتھ میں کتاب ہوتی کبھی کبھار کینٹین سے چائے پی لیتی۔اکثر اپنی نظریں کتاب پر جمائے رکھتی اِرد گرد سے بے نیاز۔کالج کے پہلے سال اُس کے کلاس فیلوز نے اُس سے دوستی کی کوشش کی تھی،اب چار سال بعد سب کو اُس کی عادت کا اندازہ ہوگیا تھا۔

اب اُس کے کلاس فیلوز جانتے تھے کہ اگر وہ حرا کے پاس بیٹھے تو وہ اُٹھ کر چلی جائے گی۔سوائے ایک کے اور وہ میں تھا۔حرا اکثر شاہین مال سے OVAL گراؤنڈ کی طرف جاتی ہوئی دو راہداریوں میں سے ایک میں بیٹھی ہوتی۔جہاں پر وہ بہت ساری نظروں سے محفوظ رہتی کیوں کہ وہ جگہ دو عمارتوں کے درمیان تھی۔OVAL گراؤنڈ کا ڈریسنگ روم اور شاہین مال کی مارکیٹ کی عمارتوں کی پشتیں آپس میں جڑی ہوئی تھیں۔اُن کے درمیان سے اسٹیڈیم کی طرف دو راستے نکلتے،جن میں سے کوئی ایک حرا کا ٹھکانہ ہوتا تھا۔

''حرا باجی...!برگر بہت مزیدار ہے۔'' حیا نے برگر کھاتے ہوئے حرا کو مخاطب کیا۔

''میرا سینڈوچ زیادہ اچھا ہے۔'' جویریہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔

''نہیں جی..!میرا تیمے والا سموسہ سب سے زیادہ تیستی ہے۔'' جاسم نے توتلی زبان میں فیصلہ سنایا۔

حرا کے بہن بھائی رات کو کھانے کی بجائے اُس کی لائی ہوئی چیزوں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

''اب تم سب دانت صاف کرو اور اپنے اپنے بستروں میں گھس جاؤ۔'' حرا اپنی کتاب پر نظریں جمائے ہی کہہ رہی تھی۔

حرا کے تینوں بہن بھائی سو چکے تھے۔ رات کے دوسرے پہر شگفتہ بانو کی آنکھ کھلی تو حرا پڑھ رہی تھی۔

''تمھیں نیند کیوں نہیں آتی... پہلے اپنے کالج جاتی ہو... پھر پتا نہیں کہاں کہاں پڑھانے جاتی ہو... پھر ٹیوشن والے بچے آجاتے ہیں۔ اُس کے بعد اپنی موٹی موٹی کتابیں لے کر بیٹھ جاتی ہو... سو جاؤ حرا بیٹی سو جاؤ...!''

''امی جی...! خواب نیندیں اُڑا دیتے ہیں، خواب سو کر پورے نہیں ہوتے اور میرا خواب اِس ملک کی بڑی ہارٹ سرجن بننا ہے۔''

''تیری ساری باتیں ٹھیک ہیں سوائے ایک کے، بیٹی...! یہ کام چھوڑ دے جو تو کرتی ہے، اگر کسی نے دیکھ لیا تو۔'' شگفتہ نے پھر حرا کو سمجھایا تھا، اُس کی ''تو'' میں بہت کچھ چھپا ہوا تھا۔

''تو کیا...! بتائیں؟'' حرا تیکھے انداز میں بولی دھیمی آواز کے ساتھ۔

''ہر بات سوال نہیں ہوتی اور نہ ہی ہر بات کا جواب ہوتا ہے۔ بس یہ جان لو اس معاشرے میں بد سے بدنام بُرا ہے۔''

''امی جی...! میں میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ آپ میرے ساتھ معرفت کی باتیں شروع کر دیتی ہیں۔''

''جسے معرفت مل جائے وہ معروف ہو جاتا ہے۔'' شگفتہ بانو نے اپنا لحاف ہٹایا اور وضو کرنے چلی گئی۔ جب وہ وضو کر کے واپس لوٹی حرا جواب سوچ کر تیار بیٹھی تھی۔ فوراً بولی:

''امی جی...! ایسی مشہوری کا کیا کرنا جس سے مشکلیں اور غم ہی دور نہ ہوں۔''

''غم سے جنم ہے...! اور جنم سے غم...!'' شگفتہ بانو نے یہ کہا اور تہجد کے لیے اپنے مصلیٰ بچھایا اور اپنے مالک کے حضور کھڑی ہو گئی۔ شگفتہ نے سلام پھیرا ہی تھا حرا فوراً بول پڑی:

''امی جی...! دُعا کریں آج میرا آخری پیپر ہے، اُس کے بعد ہاؤس جاب بس سال ڈیڑھ سال کی بات ہے پھر ان شاء اللہ سرکٹ چل جائے گا۔ میں آگے پڑھوں گی بھی اور جاب بھی کروں گی۔''

حرا کا آخری پیپر بھی بہت شان دار ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اگر میں وہاں ہوتا تو ایسا کبھی نہ ہونے دیتا۔ میں پیپر دے کر وہاں سے نکل گیا تھا۔

حرا پیپر سے فارغ ہونے کے بعد حسبِ معمول کینٹین میں بیٹھی ہوئی تھی جب عروج داؤد وہاں پہنچی۔ عروج داؤد ہماری کلاس کی دوسری لائق اسٹوڈنٹ تھی۔ اُس کی ہزار کوشش کے باوجود وہ حرا کو بیٹ نہیں کر سکی۔ عروج داؤد کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی۔ عروج اور جواد جا کر حرا کے پاس بیٹھے ہی تھے، حرا نے اپنے شولڈر بیگ میں اپنا سامان ڈالا اور وہاں سے اٹھ گئی۔

''حرا رُکو...!'' عروج داؤد غیض وغضب سے چلائی۔ حرا رُک گئی۔ عروج لپکی حرا کی طرف اور اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔

''میرا موبائل کہاں ہے...؟'' عروج نے ٹٹولتی نظروں سے صدا لگائی۔

''کون سا موبائل...؟'' حرا دھیمی آواز میں بولی۔

''وہ جو تمھارے بیگ میں ہے، دیکھو حرا...! میرا ٹمپریچر ہائی مت کرو۔ شرافت سے میرا موبائل نکال دو۔'' عروج کے لہجے میں کڑواہٹ تھی۔

''عروج...! تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرے پاس تمھارا موبائل نہیں ہے۔'' حرا نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''غلط فہمی کیسی...؟ میں گاڑی میں بیٹھی تھی گھر جانے کے لیے۔ جواد نے کہا چلو کینٹین سے چائے پیتے ہیں۔ میں نے ٹیبل پر موبائل رکھا ہی تھا کہ تم نے اُٹھا کر اپنے بیگ میں ڈال لیا۔''

عروج کی گھن گرج سے ہجوم اکٹھا ہوگیا۔ جن میں علامہ اقبال میڈیکل کالج کے کافی سارے اسٹوڈنٹس بھی تھے اس کے علاوہ مارکیٹ کے افراد بھی شامل تھے۔

''یہ جھوٹ ہے...!'' حرا نے مختصر سا جواب دیا۔

''اچھا جی...! چوری تم کرو اور جھوٹی میں۔'' عروج نے طنز سے کہا۔

''دیکھو عروج...! میں تمھیں جھوٹا نہیں کہہ رہی، میں تو صرف یہ کہہ رہی ہوں میں نے تمھارا موبائل نہیں اٹھایا۔'' حرا نے پھر سے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

''میں گواہی دیتا ہوں عروج کی نظریں کبھی دھوکہ نہیں کھا سکتیں۔'' جواد نے بات کو ہوا دی۔

''جواد اور جواز میں فرق رہنا چاہیے۔ بالکل اسی طرح جس طرح دلیل اور ذلیل میں، تم لوگ بغیر دلیل کے مجھے ذلیل کر رہے ہو اور جہاں تک دھوکے کی بات ہے، عروج ہی دھوکہ دیتی ہے حرا نہیں۔''

''ڈاکٹر حرا ڈاکٹروں والی باتیں کرو اور شیکسپئر کو کم پڑھا کرو۔ ڈرامہ چھوڑو اور موبائل واپس کر دو۔'' اس بار نیلم بولی۔

''تم لوگوں کو شرم آنی چاہیے مجھ پر الزام لگاتے ہوئے، چار سال سے ہم اکٹھے پڑھ رہے ہیں۔ میں نے کبھی کسی سے بال پین تک نہیں مانگا اور تم سب چوری کا الزام لگا رہے ہو مجھ پر، ہٹو آگے سے!'' اِس بار حرا کی آواز میں قدرے ناراضی تھی۔

''تو تم اپنے بیگ کی تلاشی دے دو۔'' جواد نے قدرے غصے سے کہا۔

''میں اپنے بیگ کی تلاشی نہیں دوں گی۔'' حرا نے دوٹوک کہہ دیا۔

''چور کی داڑھی میں تنکا۔'' نیلم نے پھر سے کہا جو کہ عروج کی بیسٹ فرینڈ تھی۔

''اگر میں چور نہ ہوئی تو... بولو ڈاکٹر نیلم ...! پھر تم تینوں کو مجھ پر جھوٹا الزام لگانے کی کیا سزا ملنی چاہیے؟'' حرا نے نیلم کو کھری کھری سنائیں۔

''تم ثابت کردو کہ تم چور نہیں ہو۔'' جواد نے پھر سے عروج کی نظروں میں ہیرو بننے کی کوشش کی۔

کافی دیر بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ حرا اپنے بیگ کی تلاشی دینے کو تیار نہیں تھی۔ شریف چاچا سموسے والا بولا:

''حرا بیٹی...! میں بھی یہی کہوں گا تم اپنے بیگ کی تلاشی دے دو۔'' شریف چاچا سموسے والا جس کی سب مارکیٹ والے عزت کرتے تھے اور سارے طالب علم بھی۔ وجہ وہ اس مارکیٹ کا سب سے پُرانا اور بزرگ آدمی تھا۔

حرا نے اپنا بیگ ہارے ہوئے سپاہی کی طرح کندھے سے اُتار کر لوہے کی میز پر رکھ دیا تھا، بالکل ویسے ہی جیسے ہاری ہوئی فوج کے سپاہی اپنے ہتھیار دشمن کے سامنے ڈال دیتے ہیں۔

نیلم نے جلدی سے حرا کے بیگ کی زیپ کھولی اور اُسے ٹیبل پر اُلٹ دیا۔ لوہے کی میز پر ایک THERMOMETER, STETHOSCOPE چند بال پین، ایک پینسل، ربڑ، اسکیل، ایک کوری کاپی اور ایک کالا شاپر بیگ پڑا ہوا تھا۔ یہ سب دیکھ کر ثاقب میرے دوست نے اُسی وقت مجھے موبائل پر اطلاع دی۔ میں نے بائیک واپس موڑ دی تھی کالج کی طرف۔

''دیکھا نا...! موبائل اِسی شاپر بیگ میں ہے۔'' عروج داؤد نے فاتحانہ انداز میں کہا تھا۔

چاچا شریف نے وہ شاپر بیگ کھولا۔ جس کے اندر کاپی کے کورے کاغذوں میں لپٹے ہوئے تین پیکٹ تھے، سب کی نظریں اُن تین پیکٹوں پر جمی ہوئی تھیں۔ چاچا شریف کے بوڑھے لرزتے ہوئے ہاتھوں نے پہلا کاپی کا کاغذ کھولا تو اُس میں اُس کے ہاتھ کے بنے ہوئے ڈھائی سموسے تھے۔ دوسرے کاغذ میں ڈیڑھ برگر اور تیسرے میں دو سینڈوچ تھے۔ حرا کی گھنٹہ بھر کی محنت رسوا ہوگئی۔ یہ سب کچھ اُس نے مختلف ٹیبلوں سے اکٹھا کیا تھا اپنے بہن بھائیوں کے لیے جو اُس کے کالج کے ساتھی بچا کر گئے تھے وہ چپکے سے اُنھیں اپنے بیگ میں ڈال لیتی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے کئی بار میں نے بھی حرا کو دیکھا تھا مگر میں خاموش رہا تھا۔ اسی کام سے حرا کی ماں بھی اُسے منع کرتی رہتی تھی۔

سارا ہجوم اندر کی کہانی سمجھ گیا تھا، کھسر پھسر شروع ہوگئی۔ ایک دوسرے کے کانوں میں کچھ چہروں پر حیرت تھی اور کچھ کتابی چہرے مسکرا رہے تھے۔ چاچا شریف نے وہ سارا مالِ غنیمت آہستہ آہستہ حرا کے بیگ میں واپس ڈالا۔ چاچا شریف کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ حرا نظریں جھکائے کھڑی تھی بالکل ایک مجسمہ کی طرح۔

''میں قسم کھا کر کہتی ہوں موبائل اِس نے برقعے کے اندر چھپایا ہے۔'' عروج داؤد کو ہار منظور نہیں تھی۔ وہ اس بار ہر حال میں حرا کو ہرانا چاہتی تھی۔

حرا نے برف کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں اٹھائیں اور عروج کی آنکھوں میں دہکتے ہوئے انگاروں کو دیکھا، انگاروں کی حدت سے حرا کی آنکھوں میں جمی برف اشکوں کی صورت میں ٹپکنا شروع ہوگئی۔ حرا اپنی ماں کا ترکی برقعہ پہنے ہوئے تھی۔ برقعہ کی ساتھی رومالی

پھٹ جانے کی وجہ سے وہ اس کی جگہ اسکارف (اسٹالر) استعمال کرتی تھی۔ اسکارف اُس کے چہرے اور سر پر ہوتا، صرف حرا کی آنکھیں نظر آتیں۔ کالی سیاہ آنکھیں جو آنسوؤں سے بھیگ چکی تھیں۔

حرا نے آہستہ آہستہ چپ چاپ اپنے ترکی برقعہ کے موٹے موٹے بٹن کھولنا شروع کیے۔ حرا کے جسم سے کالے برقعے کا پردہ اٹھ چکا تھا۔ کالے پردے کے نیچے حرا ایک گرم سوٹ پہنے ہوئے تھی جس کے اوپر دو پیوند لگے ہوئے تھے۔ سویٹر اور جرسی کی مہربانی سے کچھ غربت کے نشان برہنہ ہونے سے بچ گئے تھے۔ (پردہ عزت بھی چھپاتا ہے اور غربت بھی)۔

حرا کا پردہ اُترنے سے اس کی دونوں چیزیں ننگی ہوگئیں۔ حرا اپنے پیروں پر گھومی چکی کے پاٹوں کی طرح اسی جگہ گردن جھکائے ہوئے۔ کچھ آنکھوں میں نمی تھی کچھ ہونٹوں پر زیرِ لب مسکراہٹ ابھری۔ حرا اس مجلس کی میرِ مجلس جو ٹھہری تھی۔ اُس کے کپڑے اُس کی غربت چھپانے میں ناکام ہو چکے تھے۔ صرف اسکارف کو کامیابی ملی کیوں کہ چہرے پر نقاب ابھی بھی باقی تھا۔

حرا نے اپنے دائیں ہاتھ سے اپنی بائیں کنپٹی کے پاس لگی ہوئی پین کو چھُوا ہی تھا اپنے چہرے کو بے نقاب کرنے کے لیے اُسی لمحے چاچا شریف چیخا زور سے...

"نا...نا...میری بچی...! ایسا مت کرو...دفع ہو جاؤ تم سب یہاں سے...بے حیاؤ دفع ہو جاؤ...!"

اُسی لمحے میں نے اپنی موٹر سائیکل عروج داؤد کی گاڑی کے ساتھ کھڑی کی۔ میں نے دیکھا چابی اسٹیرنگ کے نیچے لٹک رہی تھی اور عروج کا موبائل ساتھ والی سیٹ پر پڑا ہوا تھا۔ جس وقت جواد نے عروج کو چائے کے لیے کہا وہ جلدی سے گاڑی سے اُتری اور جواد کے ساتھ چل دی۔ عروج جواد میں بہت زیادہ انٹرسٹ لیتی تھی۔

"عروج...! تمھارا موبائل...!" میں بھاگتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔ اُس وقت سب لوگ نظریں جھکائے مڑ رہے تھے۔ سب نے حیرت سے میرے ہاتھ کی طرف دیکھا جس میں موبائل تھا۔

"یہ سارا تماشا عروج نے لگایا ہے۔" ثاقب نے مجھے بتایا۔ میں نے قہر آلود نگاہوں سے عروج کی طرف دیکھا۔ چند آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

"چاچا شریف ہمیں کیوں ڈانٹ رہے ہیں۔"

"سارا قصور عروج کا ہے۔"

"حرا اتنی غریب ہے...؟"

"اُس نے کبھی اپنی غربت کا ذکر تو نہیں کیا۔"

"میں تو سمجھتی تھی کسی کھاتے پیتے گھر سے ہوگی۔"

"پر ہے تو سب سے لائق۔"

''اب سمجھ آئی وہ الگ الگ کیوں رہتی تھی۔''

''کیسے کیسوں کو میڈیکل کالج میں داخلہ مل جاتا ہے۔'' نیلم نے حقارت سے آخری جملہ بولا تھا۔

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں... تم جیسی کردار کی گندی لڑکیوں کو تو بالکل نہیں ملنا چاہیے۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''توقیر...! اپنی حد میں رہو...! اپنی حیثیت دیکھ کر بات کیا کرو۔'' جواد نے مجھے دھمکی دی تھی۔

''تمھاری اور عروج کی اسٹوری سناؤں...؟ اور نیلم تمھاری ہسٹری سے بھی میں اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ لو اپنا موبائل...!'' میں نے عروج کے ہاتھ پر موبائل پٹخ دیا۔

اُن تینوں نے وہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔ چاچا شریف نے حرا کے سر پر ہاتھ رکھا اور اُس کا برقعہ کرسی کی ٹیک سے اُٹھا کر اُسے تھمادیا اور خود اپنے آنسو صاف کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ حرا نے اپنا برقعہ پہنا اور خاموشی سے نظریں جھکا کر وہاں سے چلی گئی۔

میرا اور حرا کا رشتہ بھی عجیب تھا۔ اُس نے کبھی مجھے آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا اور میری ہمت نہیں ہوئی کہ اُس کو آنکھ بھر کر دیکھ لوں۔ اِس کے باوجود ہم کبھی کبھی اکٹھے چائے پی لیتے تھے۔ حرا میری کلاس فیلو تھی اور مجھ سے بہت لائق تھی۔ محمد نوید شاہ کی حرا نوید شاہ میری زندگی میں نوید بن کر آئی اور میری توقیر میں اضافہ کیا۔

آج وہ حرا توقیر شاہ کے نام سے جانی جاتی ہے جو کہ پاکستان کی مشہور ہارٹ سرجن ہے۔ وہ آج بھی حجاب کرتی ہے۔ حرا مجھ سے اکثر کہتی ہے:

''ڈاکٹر صاحب...! عورت کا پردہ اُس کی عزت بھی بڑھاتا ہے اور اُس کی غربت بھی چھپاتا ہے۔''

حرا نے اپنے سارے کلاس فیلوز کو معاف کر دیا تھا مگر وہ اُن میں سے کسی کو نہیں ملتی۔

حرا کی زندگی کی کتاب میں وہ دن بک مارک ہے، زندگی کے پنّے تو آگے بڑھتے رہے۔ بک مارک وہیں ہے۔ کسی کی عزت کا حجاب کبھی نہیں اتارنا چاہیے۔ نہیں تو زندگی آگے بڑھ جاتی ہے بک مارک وہیں رہتا ہے بالکل حرا کی طرح۔ حرا اُس دن کو بھول نہیں سکی آج تک۔ آج آٹھ سال بعد حرا نے اپنے سارے خواب پورے کر لیے۔ اُس نے اپنا آبائی گھر نئے سرے سے تعمیر کروایا، اس سال میں اور حرا اس کی امی کو حج پر لے کر گئے تھے۔ اس کے بہن بھائی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ حرا اب بڑی پُرسکون نیند سوتی ہے۔ ایک پرسنل بات بتاتا ہوں: ہوسکتا ہے آپ کو یقین نہ آئے میں نے حرا کا چہرہ پہلی بار اپنی شادی والی رات کو دیکھا تھا۔ اُسی لمحے پہلی دفعہ حرا نے مجھ سے نظریں ملائی تھیں۔

حرا سچ میں حیاء والی حرا ہے۔

مائی چیمی کا فیصلہ

”بڑے فیصلے انسان کو بڑا بناتے ہیں، کھجور کا پھل اور فیصلے کا ثمر دیر سے ملتا ہے، جب تک تم دونوں حق پر فیصلے کرتے رہو گے تمھارا ڈیرہ آباد رہے گا۔ پنچائت میں نہ جھوٹ بولنا اور نہ ہی جھوٹے کی وکالت کرنا، پولیس کے سپاہی سے کبھی نہ بگاڑنا، تھانے دار آتے جاتے ہیں، سپاہی وہی رہتے ہیں۔

کچہری کے چکر لگا کر بندے رُل جاتے ہیں۔ تگڑے سے تگڑا وکیل بھی پٹواری کے لکھے ہوئے کو مٹا نہیں سکتا، پٹواری پواڑہ (فساد) ڈالتا ہے، اُس سے بنا کر رکھنا۔“

1965ء میں دسمبر کے جاڑوں کی راتوں میں سے ایک رات مائی چیمی اپنے پوتوں امانت اور سلامت کو سمجھا رہی تھی زندگی کے گُر... اور فیصلے کرنے کے اُصول۔ امانت اور سلامت اپنی دادی کی باتیں سنتے سنتے سو گئے۔

”زہرہ بیٹی! ویروں (بھائیوں) پر رضائی اچھی طرح ڈال دو اور تم بھی سو جاؤ۔“ مائی چیمی نے لالٹین کو بجھاتے ہوئے اپنے بستر پر کمر سیدھی کی اپنا گول تکیہ ایک طرف رکھا اور سو گئی۔

مائی چیمی ایک بیوہ عورت، جس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ بیٹے اور بہو سے زیادہ اُسے اپنی بارہ سالہ پوتی زہرہ، دس سالہ امانت اور آٹھ سالہ سلامت زیادہ پیارے تھے۔ وہ اصل سے زیادہ سود سے محبت کرتی تھی۔

چانن پور گاؤں کے سارے فیصلے پچھلے اٹھارہ سالوں سے مائی چیمی کرتی آ رہی تھی، اس کا ہر فیصلہ اپنی مثال آپ تھا۔ مائی چیمی بڑے سے بڑے کھڑپینچ کو آناً فاناً اپنی دانائی سے زیر کر دیتی، وہ دھیرج سے دونوں اطراف کی اول فول سنتی رہتی، مائی چیمی کا لب ولہجہ اور طرزِ تکلم بلبل کی مانند میٹھی زبان میں ہوتا تھا۔

اگلی صبح ہی اس کے پاس گاؤں کی ایک بیٹی کا فیصلہ آ گیا جو پاس والے گاؤں میں بیاہی تھی اور ناراض ہو کر میکے میں بیٹھی تھی۔ لڑکے والے لڑکی کے گھر جانے کی بجائے مائی چیمی کے ڈیرے پر آئے تھے۔

”بہن چیمی آپ سے فیصلہ کروانا ہے۔“ رحمت جوئیہ نے کہا جو کہ شہباز جوئیہ کا تایا تھا۔

”اپنا پتر شہباز اپنی گھر والی کو وسانا (بسانا) چاہتا ہے پر کڑی اڑ کر بیٹھی ہے کہ مجھے لخط (طلاق) چاہیے۔ نہ تو ہمارے پینڈ میں کسی نے کبھی لخط دی ہے اور نہ ہی ہمارے پنڈ کی کسی دھی (بیٹی) کو لخط ہوئی ہے۔“

رحمت جوئیہ بولتا رہا اور مائی چیمی سنتی رہی۔ پنچائت بیٹھ چکی تھی۔ چانن پور گاؤں والوں کی نظریں مائی چیمی پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''لخط لینے سے بہتر ہے...توئے کی کالک منہ پر مل لی جائے۔ اگر لخط ہوئی تو اس علاقے میں ایسا پہلی بار ہوگا اور اُس کی ساری ذمہ داری چانن پور والوں پر ہوگی۔'' رحمت جوئیہ نے آخری بات کی۔

''چودھری رحمت! طلاق حلال ہے...حلال کام کرنے سے منہ کالا نہیں ہوتا اور جہاں تک توئے کی کالک کی بات ہے اُسے پانی دھو دیتا ہے اور گناہوں کی کالک پانی سے صاف نہیں ہوتی...تم صرف گناہوں کی کالک کی فکر کرو...توئے کو ہم خود ہی مانج (صاف) لیں گے...کھانا کھا کر جانا فیصلہ کل ہوگا۔'' مائی چیمی نے تحمل سے جواب دیا۔

اُسی دن رات عشاء کے بعد بشیر حسین کے گھر چانن پور گاؤں کے سارے سیانے اکٹھے ہوئے۔ شبانہ عرف شبو، شہباز جوئیہ کی بیوی تھی اور بشیر حسین کی بیٹی۔

جب شبو کا رشتہ بشیر نے قبول کیا تھا مائی چیمی نے اُسی وقت ہی کہا تھا:

''پا بشیر! تم نے مشورہ کرنا بھی بہتر نہ سمجھا، شبو میری بھی دھی ہے، میں تمھیں اچھا مشورہ ہی دیتی۔''

''بس آپا وڈی (بڑی)! کیا بتاؤں انھوں نے مجھے اپنے ڈیرے پر بلایا، رشتے کی ہاں کروا کر ہی اٹھنے دیا۔ اچھا بھلا اپنے ماسی کے پتر کی منگ تھی۔ اُس شودے نے انکار کر دیا۔'' بشیر حسین خود کو ملامت کر رہا تھا۔

بشیر حسین کی ایک بھیگا زمین جوئیہ خاندان کی زمین کے ساتھ تھی جہاں پر چانن پور کا رقبہ ختم ہوتا وہاں سے دھڑی وال کا رقبہ شروع ہوتا۔

جوئیہ خاندان دھڑی وال کے چودھری تھے اور بشیر حسین اُن کا مزارع۔ ایک دن شہباز جوئیہ کی نظر شبانہ عرف شبو پر پڑی تو اُس نے شبو کا راستہ روک لیا۔

''کیا تو بشیرے کی بیٹی ہے؟''

شہباز جوئیہ اپنی نیلی اتھری گھوڑی پر بیٹھے بیٹھے ہی بولا۔ شبو نے شہباز کو دیکھے بغیر سر کو ہاں میں جنبش دی نیچی ہوئی آنکھوں کے ساتھ۔ قرب وجوار میں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ شبو اپنے باپ کو کھانا دینے کھیتوں میں آئی تھی۔ اُس دن اس کی ماں کی طبیعت جو خراب تھی۔ شہباز جوئیہ بھونڈے اور لچر پن سے پھر بولا:

''تیرے حسن کی بڑی دھوم سنی تھی...سب سچ کہتے ہیں...جو سنا تھا اس سے بڑھ کر دیکھ لیا۔''

شہباز جوئیہ نے گھوڑی سے چھلانگ لگائی اور شبو کی طرف بڑھا۔ شبو نے جلدی سے اپنے باپ کی درانتی اپنی چادر سے نکال کر شہباز جوئیہ کی طرف تان دی۔ جب شبو نے شہباز کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا اُس نے اُسی لمحے درانتی اپنی حفاظت کے لیے اپنی چادر

میں چھپالی تھی۔

''چودھری! آگے نہ بڑھنا۔'' شبو نے اپنی بند آنکھیں کھولیں، آنکھوں میں انگارے بھرے ہوئے تھے۔

''اوئے ہوئے... آنکھوں میں بھانبھڑ (الاؤ) ہیں... اُتھری گھوڑی اور اُتھری کڑی دونوں ہی شہباز جوئیہ کی ضد ہیں۔''

''چودھری! کسی کی امانت کو اپنی ضد مت بنا... گھوڑی ضد ہو سکتی ہے... کُڑی نہیں...'' شبو نے اعتماد سے جواب دیا سخت لہجے میں۔

''ایک ضد دوسری ضد پر بیٹھ تو سکتی ہے... آ جا! رانی بنا دوں گا تجھے... جو آگ تو نے لگائی ہے... بس اُسے بجھاتی جا...'' شہباز جوئیہ نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے ہونٹوں کو دانتوں سے چباتے ہوئے کہا۔

''میں کسی اور کے دل کی رانی ہوں... چودھری! ہٹ جا میرے راستے سے۔'' شبو نے درانتی کو کس کر پکڑا اور غصے سے شہباز جوئیہ کو للکارا۔

''یا تو میں تجھے مار دوں گی... نہیں تو اپنی جان دے دوں گی... پر جو تو چاہتا ہے وہ کبھی نہیں ہو سکتا۔'' شبو نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

شہباز جوئیہ ایک بھیڑیئے کی طرح شبو پر ٹوٹ پڑا اور اُسے اپنی تگڑی گرفت میں لے لیا، درانتی چھین کر اُسے دور پھینک دیا۔

''کنجر!... دلّے... بے غیرت...!'' شبو نے شہباز کی گرفت سے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا۔

باسمتی چاول کی فصل اپنے جوبن پر تھی اور وہ جگہ دونوں دیہاتوں کے درمیان میں، دوپہر کا وقت بھی شہباز جوئیہ کے حق میں تھا۔ شہباز اور شبو کی نورا کشتی جاری تھی، وہ گتھم گتھا تھے۔

''چھوڑ دے بے غیرت مجھے!'' شبو ایک زخمی شیرنی کی طرح غرائی۔

''تو ایک مرد کے شکنجے میں ہے۔'' شہباز جوئیہ چلایا۔ اچانک شبو کے ہاتھ وہ درانتی لگ گئی۔ اس نے پورے زور سے چلائی جو شہباز کے بائیں بازو پر جا کے لگی، گھاؤ گہرا تھا، شہباز جوئیہ زمین پر بیٹھ گیا دائیں ہاتھ سے اپنے بائیں بازو کو پکڑے ہوئے۔

''اَخ تھو...'' شبو نے شہباز کی طرف تھوکا حقارت سے۔

''تو اپنے آپ کو مرد کہتا ہے... پہلے تو بھکاری بنا اور اپنی خواہش کی بھیک مانگی... پھر تو ڈاکو بن گیا... مرد کدھر سے ہے تو؟ بھکاری مانگتا ہے... اور ڈاکو چھینتا ہے... صرف مرد حاصل کرتا ہے... لعنت تجھ جیسے مرد پر...!''

شبو کے کپڑے کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے، اُس کے جسم پر جگہ جگہ شہباز کی درندگی کے نشان تھے پر اس کی عزت بچ گئی۔ شبو نہ روئی تھی اور نہ ہی اُس نے شہباز سے رحم کی اپیل کی تھی۔ وہ لڑی اپنی عزت کی حفاظت کے لیے اور جیت گئی۔ گھر واپسی پر اُس نے کھال سے منہ دھویا، اپنے بال سمیٹے، اپنی چادر سے اپنا چہرہ اور جسم ڈھانپا اور چپ چاپ گھر واپس آ گئی۔

اگلے دن ایک خبر آئی اُس کے ماسی کے بیٹے اور منگیتر نے منگنی توڑ دی۔ چودھری شہباز نے شبو کے منگیتر صابر کے کان بھرے

اور ایک ہفتہ کے اندر اندر اُس کا نکاح اپنے گاؤں کی ایک لڑکی سے کروا دیا۔ اب تک اندر کی بات شبو اور شہباز کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ چند دن بعد شبو کے باپ نے گھر آ کر فیصلہ سنایا:

''کل شبو کی جنج (برات) دھڑی وال سے آ رہی ہے۔''

شبو نے بہت شور شرابہ مچایا پر اس کا باپ زبان دے چکا تھا۔ شبو کا بھائی شاہد جو کہ اس وقت میٹرک میں تھا وہ اپنی بہن کے بہت قریب تھا اس نے شبو کو قسم دے کر ساری بات پوچھ لی۔

''شبو باجی! تم شادی کر لو... اللہ خیر کرے گا۔'' شاہد حسین نے اپنی بہن کو مشورہ دیا۔

سارے لوگ برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مائی چیمی اندر شبو کے پاس چلی گئی۔ شبو گم سم بیٹھی تھی۔ شاہد اُس کے پاس تھا۔

''شبو بیٹی! مجھے لگتا ہے... کچھ گپت (راز) ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو... دیکھو دھی رانی! مجھے سچ سچ بتاؤ اندر کی بات...''

شبو نے ساری بات مائی چیمی کو بتائی۔ شاہد بھی وہیں موجود تھا۔ شبو نے اپنے آنسو صاف کیے۔

''شاہد تم باہر جاؤ!'' شبو نے شاہد سے کہا۔ شاہد باہر چلا گیا۔

''اب تم کیا چاہتی ہو؟'' مائی چیمی نے پوچھا۔

''ابھی آپ نے ساری بات سنی کہاں ہے۔ شاہد کے سامنے بتا نہیں سکتی تھی۔'' شبو نے مائی چیمی کو جواب دیا۔

''اماں چیمی! شادی کی پہلی رات ہی سے شہباز میرے جسم کو گدھ کی طرح نوچ رہا ہے۔ وہ روز رات کو شراب پی کر آ جاتا اور صبح تک میرے جسم کو نوچتا رہتا ہے۔ اماں چیمی! وہ میرے جسم پر جلتی ہوئی سگریٹ بجھاتا ہے اور کہتا ہے:

تم میری ملکیت ہو جو چاہے تمھارے ساتھ کروں... مجھے کون روک سکتا ہے... یہ بھی کہتا ہے:

ابھی ضد پوری کی ہے... انتقام ابھی باقی ہے... شہباز کے ساتھ بیس دن میں نے انگاروں پر گزارے ہیں۔'' شبو نے اپنے خاموش آنسو صاف کیے جو چپ چاپ گرتے جا رہے تھے، مائی چیمی اور شبو رات گئے تک باتیں کرتی رہیں۔

اگلے دن مائی چیمی کے ڈیرے پر پنچائت لگ گئی۔ مائی چیمی اپنے رنگلے پلنگ پر گول تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے پوری شان سے بیٹھی تھی۔ پچپن سال کی عمر میں بھی کسی جوان کو کلائی سے پکڑ لے تو وہ چھڑا نہ سکے... مائی چیمی اونچے لمبے قد کاٹھ کی پُر وقار عورت تھی۔

چودھری رحمت نے بولنا شروع کیا ہی تھا کہ شہباز بول پڑا۔ اُسے اپنے تایا کا مائی چیمی کے سامنے عاجزانہ لب ولہجہ ناگوار گزرا تھا۔

''تایا! اتنے ترلے کیوں ڈال رہے ہو... مائی نے اگر فیصلہ ہمارے حق میں نہ دیا تو... میں شبو کو اُٹھا کر لے جاؤں گا۔'' شہباز جوئیہ نے اپنے تیور دکھائے۔

''چودھری رحمت! پٹا ڈال اس منڈے کو...! نہیں تو.... مجھے ڈالنا آتا ہے۔'' مائی چیمی نے تحمل سے کہا۔

''کا کا شہباز! شبو کو اُٹھانے سے پہلے تو اُٹھ جائے گا دنیا سے...'' مائی چیمی کی آواز پر چانن پور کے لوگوں نے لبیک کہا۔

''چودھری برکت! سمجھا اپنے بیٹے کو پنچائت میں بڑوں کی بات میں نہیں بولتے۔'' ماسٹر نذیر نے شہباز کے باپ کو یاد کرایا۔

پوری پنچائت میں شور پڑ گیا۔ کوئی کہہ رہا تھا:

''ہم نے کُڑی نہیں بھیجنی، دھڑی وال والے جو کر سکتے ہیں کر لیں۔''

دوسری طرف سے آواز آئی:

''بڑا بے ہدا ایتا منڈا ہے...تائے نے بگاڑ دیا ہے۔''

مائی چیمی نے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ پنچائت میں خاموشی چھا گئی۔

''چودھری رحمت! تو بول کیا چاہتا ہے؟'' مائی چیمی نے چودھری رحمت کو مخاطب کیا۔

''بہن چیمی! کُڑی ٹور دے۔'' چودھری رحمت نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

''چودھری رحمت! ٹھیک ہے... پر میری کچھ شرطیں ہیں...شبو میرے گھر سے جائے گی میری بیٹی بن کر، حق مہر میں دس ایکڑ زمین شبو کے نام لکھ دو... چودھری رحمت! بے شک طلاق حلال ہے پھر بھی کوئی ماں اپنی بیٹی کے لیے طلاق نہیں چاہتی... یہ فیصلہ میں نے ماں بن کر کیا ہے...منصف بن کر نہیں...تم دونوں بھائیوں کا رقبہ ملا کر بھی میرے رقبے کا آدھا بنتا ہے، تحصیل میں بھی میری زیادہ چلتی ہے، تیرا آدھا گاؤں تیرے ساتھ ہے اور میرا پورا گاؤں میرے ساتھ کھڑا ہے، تھانے دار میرے اشارے کا منتظر ہے... جو باتیں تیرے منڈے کے بارے میں مجھے پتہ ہیں کوئی نہیں جانتا...کا کا شہباز! کان کھول کر میری بات سن! اب شبو بشیر حسین کی بیٹی نہیں...چیمی جٹی کی بیٹی ہے... یاد رکھنا! مائی چیمی جٹی کی بیٹی! شکر کر میں نے تجھے جوائی مان لیا ہے۔ اگر شبو کو کنڈا اچھا تو تجھے لوہے کا سوا چبھو دوں گی۔ چودھری رحمت تو اچھی طرح میری زبان کو جانتا ہے۔ کل شبو کو تحصیل لے جاؤ اور اُس کے نام دس ایکڑ لگا دو پھر میں شبو کو تمھارے ساتھ بھیج دوں گی۔''

مائی چیمی نے اپنا فیصلہ سنایا۔ رحمت جوئیہ اور برکت جوئیہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اس سے پہلے وہ مشورہ کرتے شہباز جوئیہ فٹا ک سے بول پڑا:

''منظور ہے!''

پنچائت ختم ہو گئی۔ سارے لوگ چلے گئے۔

''اماں چیمی! دس ایکڑ میں دس ہزار قبریں بن جاتی ہیں تم نے صرف میری قبر بنائی ہے۔'' شبو نے فیصلے کے بعد مائی چیمی سے کہا۔

''اگر تمھاری قبر بنی تو اس کے ساتھ شہباز جوئیہ کا مقبرہ ضرور بنے گا۔'' مائی چیمی نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔

''وہ جو کہتی ہے...وہ کر دیتی ہے...میرا مشورہ مانو لخط دے دو میں اپنی رجو بیٹی کا ساکھ (رشتہ) دیتا ہوں۔'' رحمت جوئیہ کہہ رہا تھا

برکت اور شہباز کو...

''برجھائی سمجھا اپنے لاڈلے کو...اوئے شہباز! تجھے پُتر سے بڑھ کر چاہا ہے۔'' رحمت جوئیہ فکرمندی سے کہہ رہا تھا۔ وہ فکر کیوں نہ کرتا رحمت اور برکت کی سات بیٹیوں میں صرف ایک بیٹا شہباز ہی تھا۔

''میں نے بچپن سے تجھے جوائی مان لیا تھا...رجو تیرے نام کی انگوٹھی پہن کے بیٹھی رہی اور تو نے ایک کمّی کی دھی کو کپڑے پہنا دیے۔''

''تایا! میں رجو سے نکاح کرلوں گا...بس آخری ضد پوری کردے...میں نے شبو کو ایک بار لے کر آنا ہے...کسی بھی شرط پر...اُس کے بعد اسے...''

''اُسے کیا؟ ہمیں بھی تو بتا۔'' اس بار برکت جوئیہ بولا غصے سے۔

جوئیہ خاندان نے مائی چیمی کی شرط مان لی۔ شبو کی دوبارہ رخصتی ہوئی مائی چیمی کے گھر سے۔ شہباز جوئیہ نے بڑے اعزاز سے شبو کو اپنی نیلی گھوڑی پر بٹھایا اور اپنے گھر کی بجائے اپنے ڈیرے پر لے آیا جو گاؤں سے ہٹ کر تھا۔

''دیسی دارو ہے...چکھ لے...! تھوڑی کڑوی ہے...! پہلے کون سا تو میٹھا بولتی ہے۔'' شہباز جوئیہ شراب کے نشے میں دُھت گلاس شبو کی طرف بڑھا کر بولا۔

''دیکھ! میں نے ایک ضد کو دوسری ضد پر بٹھا ہی لیا۔ تجھے نیلی گھوڑی پر بٹھا کر لایا ہوں۔''

گدھ مردار کھاتے ہیں...وہ زندہ جسم کو نوچتا تھا۔ شہباز نام ہونے کے باوجود وہ ذات کا گدھ ہی تھا اُس نے شبو کے ننگے دھڑنگے جسم کو رات بھر نوچا...صبح سے پہلے اُس ننگے بدن کو کپڑے پہنانے کا حکم ملا...شبو نے کپڑے پہن لیے۔ فجر کی اذان ہو چکی تھی۔ سخت سردی میں باہر کُہرا جما ہوا تھا۔ شہاز نے کہا:

''چلو گاؤں چلتے ہیں۔''

شبو کو اُس نے پھر سے گھوڑی پر بٹھایا اور اپنے ڈیرے پر موجود کنویں کے پاس آ کر رُک گیا۔ شبو نے شہباز کی طرف دیکھا، شہباز کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ اُبھری۔

''دن نکلتا ہے پھر گاؤں چلتے ہیں، تم گھوڑی سے اُتر آؤ سردی بھی بہت ہے۔'' شہباز نے ہاتھ بڑھایا شبو گھوڑی سے نیچے اُتر آئی چپ چاپ۔ وہ مسلسل شہباز کے چہرے کو دیکھ رہی تھی شاید کچھ پڑھنا چاہ رہی تھی۔ شبو کے پچھلی طرف کنواں تھا اور سامنے دلدل یعنی شہباز جوئیہ۔

''مائی چیمی! یہاں اس وقت...'' شہباز اچانک بول پڑا۔ شبو نے پلٹ کر دیکھا۔ اسی لمحے شہباز نے شبو کو کنویں میں دھکیل دیا۔

تڑکے ہی چانن پور گاؤں میں شبو کے مرنے کی خبر پہنچی پر مختلف انداز میں...

''شبو نے شہباز کو زخمی کیا اور خود وہاں سے بھاگی...تاریکی ہونے کی وجہ سے کنویں میں گر گئی۔''

شبو کی موت کو تین دن گزر گئے۔ مائی چیمی ایک دم خاموش ہوگئی تھی۔ چوتھے دن پنچائیت بیٹھ گئی۔

''جو کچھ شہباز جوئیہ نے اپنی صفائی میں کہا ہے میں اُسے سچ مانتی ہوں۔'' یہ کہہ کر مائی چیمی اپنے پلنگ سے اُٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔

''یہ کیسا فیصلہ ہے؟''

''جو سچ ہے!''

کسی اور سے فیصلے کروالیا کرو چانن پوروالو!''

''تو کیا شہباز جوئیہ کو سولی پر لٹکا دیتی؟''

''مائی چیمی بوڑھی ہوگئی ہے۔''

''میں نے پہلے ہی کہا تھا شبو کو مت بھیجو!''

''ہم اٹھارہ سال سے مائی چیمی کا ہر فیصلہ مانتے آئے ہیں، یہ بھی مانتے ہیں۔'' برکت جوئیہ نے آخری بات کہی تھی، رحمت جوئیہ فکر مند تھا۔

''تایا تو کیوں فکر کرتا ہے؟'' شہباز جوئیہ نے رحمت جوئیہ سے کہا۔

''تو ابے کو نکاح کی تاریخ دے...فکر نہ کر...تایا!''

''ابھی قبر کی مٹی گیلی ہے اور زخم ہرے ہیں...ابھی نہیں شہباز پتر! تو شہر چلا جا چند دنوں کے لیے۔'' رحمت جوئیہ رندھی آواز کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

''چھوڑ تایا! شہر چلا جا...'' شہباز نے اپنی چادر کو جھاڑا اگرجتے ہوئے۔

چند دن گزر گئے خاموشی سے کئی فیصلے آئے مائی چیمی کے پاس مگر مائی چیمی جٹی نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ ایک دن خبر آئی شہباز جوئیہ بھی اُسی کنویں میں گر کر مر گیا ہے۔ سارے علاقے میں مشہور ہو گیا کہ وہ ڈیرہ منحوس ہے اور وہاں جنوں اور ڈائنوں کا قبضہ ہے۔

اس کہانی کا پورا سچ صرف چار لوگ جانتے تھے۔ شہباز جوئیہ، شبانہ عرف شبو، مائی چیمی جٹی اور میں....جی ہاں میں! تین لوگ اب اس دنیا میں نہیں ہیں صرف میں زندہ ہوں۔ جس دن شہباز کنویں میں گرا تھا اُسی رات مائی چیمی نے مجھے اپنے گھر بلایا تھا اور اِس کہانی کا سارا سچ بھی بتایا، بہت ساری نصیحتیں کیں اُس رات کے بعد مائی چیمی جٹی نے کبھی صبح کا اُجالا نہیں دیکھا۔ اُسے اپنے غلط فیصلے پر بہت پچھتاوا تھا۔ نرم بستر سے قبر کی سخت زمین پر لیٹنے سے پہلے اُس نے مجھے شہباز کی جاسوسی کے لیے کہا تھا۔ میں کئی دن شہباز کی جاسوسی کرتا رہا ایک دن شہباز جوئیہ ایک ویشیا کو لے کر آیا شہر سے...اپنے سارے دوستوں کو اس نے بھیج دیا تھا۔ آدھی رات تک ویشیا اور شہباز شراب پیتے رہے۔

اُس کے بعد اُن دونوں نے منہ کالا کیا۔رات کے پچھلے پہر شہباز پیشاب کی غرض سے کمرے سے باہر نکلا۔میں نے کمرے کی باہر سے کنڈی لگادی۔وہ لڑکی نشے میں دُھت سوئی ہوئی تھی۔ مائی چیمی نے شہباز کو اکیلے ہی دبوچ لیا۔میں نے مدد کرنی چاہی تو مائی چیمی بولی:

''بیٹا! تیرا کام صرف مخبری کرنا تھا۔''

شہباز جوئیہ کو کنویں میں جنوں نے نہیں گرایا تھا۔اُسے مائی چیمی نے یوں مارا جیسے پاگل کتے کو مارا جاتا ہے۔اتنا مارا کہ وہ خود موت کی بھیک مانگنے لگا پھر اُس سے پوچھا کہ تم نے شبو کو کیسے مارا؟ اُس نے بتایا کہ وہ پوری رات نشہ کر کے اُس کے جسم کو نوچتا رہا پھر صبح نیلی گھوڑی پر بٹھا کر کنویں تک لایا اور دھوکے سے اُسے دھکا دے دیا۔

مجھے آج بھی یاد ہے اچھی طرح سے مائی چیمی کے الفاظ:

''کاکا شہباز! تو بچ سکتا ہے...اگر تو مجھے کنویں میں گرا دے پھر نہ کہنا مائی چیمی نے انصاف نہیں کیا۔''

شہباز جوئیہ نے کوشش بہت کی اپنی جان بچانے کی مگر ناکام رہا۔میں نے ہمیشہ مائی چیمی کی بلبل کی مانند میٹھی آواز سنی تھی۔اُس دن مائی چیمی کی آواز میں کٹھور پن اور ہیبت تھی، اُس نے شہباز کی کسی التجا پر کان نہیں دھرے۔مائی چیمی نے شہباز کو گریبان سے پکڑا اور اُسے کنوئیں میں پھینک دیا، میں پاس کھڑا تھا۔

مائی چیمی کو اس فیصلے پر شبو کے والدین اور بھائی نے مجبور کیا تھا۔مجھے پچاس سال پہلے کہے ہوئے شبو کی ماں کے الفاظ اچھی طرح سے یاد ہیں:

''آپا وڈی! فیصلہ منصف بن کر نہیں...ایک ماں بن کر کرنا...شبو کی ماں بن کر...میں نہیں چاہتی کہ شبو لحظ لے۔''

مائی چیمی نے شبو کے گھر والوں کی خواہش پر وہ فیصلہ کیا تھا جو اس کا آخری فیصلہ ثابت ہوا۔مجھے مائی چیمی نے ایک نصیحت یہ بھی کی تھی:

''منصف فیصلوں کی جگہ رشتوں کو ترجیح دے تو فیصلے غلط ہوتے ہیں اور ایک غلط فیصلہ کئی زندگیاں برباد کر دیتا ہے۔''

میں نے مائی چیمی کی باتوں کو ہمیشہ یاد رکھا اپنے فیصلوں کے دوران اور آج میں سرخرو ہوں۔

آج پچاس سال بعد بھی مائی چیمی کو نہیں بھولا صرف اس کے فیصلوں کی وجہ سے۔آج میری آنکھوں میں آنسو ہیں اپنی دلیر بہن کو یاد کر کے۔مجھے فخر ہے کہ میں مائی چیمی جٹی کا شاگرد اور شبو کا بھائی ہوں!

ریٹائرڈ جسٹس شاہد حسین

مولوی اسلامو کا کچا کوٹھا

''مولوی جی......! چلانی کے پانڈے ختم ہو گئے، پر چوئے کے تھاں ختم نہ ہوئے (رسوئی کے برتن ختم ہو گئے پر پانی ٹپکنے والے مقام ختم نہ ہوئے)۔'' پروین نے غصے اور بیزاری سے کہا۔

''کچا کوٹھا ہی سہی اپنا تو ہے، تیرے بھائیوں کی طرح کرائے دار تھوڑی ہیں۔'' مولوی اسلام دین نے فخر سے جواب دیا جو کہ ڈھیلی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ پھٹا ہوا کھیس اُس کے اوپر تھا۔

''پھر وہی طعنے...... کرائے پر ہی سہی رہتے تو لاہور شہر میں ہیں۔ مولوی جی اس پنڈ کا نام کلخانہ نہیں...... خصماں نوں خانہ...... ہونا چاہیے تھا یا پھر کل کھانا...... جب بھی کھانے کو کچھ مانگا...... کل کھانا.. کلخانہ...... خصماں نوں خانہ۔'' پروین نے کرخت لہجے کے ساتھ حساب چکتا کر دیا۔

''شکر کر پینو......! شکر کر...... کھا کے سوتی ہے...... کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تو بھوکی سوئی ہو۔'' مولوی اسلامو نے اپنی چارپائی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ مولوی اسلامو پر چھت سے پانی ٹپکنا شروع ہو گیا اُس نے اپنی چارپائی کھسکائی...... پینو کی بتیسی نکل آئی تھی مولوی اسلامو کو دیکھ کر۔

''مولوی جی......! اور کرو شکر...... شکر سے نہ تو پانی ٹپکنا بند ہوتا ہے اور نہ ہی خالی پیٹ بھرتا ہے۔ شُکر ہے...... شکر نہیں کہ منہ میٹھا ہو جائے...... اب تو زبان سارے سواد ہی بھول گئی ہے...... کیا میٹھا...... کیا کھٹا...... سوجی کا حلوہ کھائے ہوئے صدیاں ہو گئیں، چونگی امرسدھو میں ہمارے گھر کے سامنے گندے نالے کے اوپر کھٹے آلو چھولے ملتے ہیں۔ پا رشید ہر روز گھر آتے ہوئے میرے لیے آلو چھولے لے کر آتا تھا۔ یہاں صرف آلو ہی آلو ہیں۔''

پینو کے منہ سے آلو سن کر مولوی اسلامو کو یاد آیا جب وہ صدیق آرائیں سے اپنی سیپ (اُجرت) کی گندم لینے گیا تو صدیق آرائیں نے آلو سستے ہونے کی وجہ سے ایک من گندم کی جگہ ایک من آلو دے دیے۔

''مولوی صاحب! آپ کی مسجد کی کمیٹی بھی نالائق ہے، بھلا یہ بھی کوئی گل ہے۔ مربعوں والے بھی ایک من اور ہم ٹھیکے والے بھی ایک من گندم اور مونجی۔'' مولوی اسلامو خیال کی آنکھ سے صدیق آرائیں کو بولتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''تو بھی شروع ہو جا... تیری کسر باقی تھی۔'' پینو کی آواز سن کر مولوی اسلامو کی خیال کی آنکھ بند ہو گئی۔ کمرے کے ایک کونے میں

پڑی ہوئی آلوؤں کی بوری سے اُس کی آنکھیں ہٹ کر پینو کے چہرے پر جا ٹھہری تھیں۔

''تیری کسر باقی رہ گئی تھی۔'' پینو کی نظر اپنے دوسال کے بیٹے پر پڑی جس کے کھیس کے اوپر پانی ٹپک رہا تھا۔

''ہفتے میں تین دن تو ہم لوگ شوربے والے آلو کھاتے ہیں، تین دن لسی کی کڑی، ساتواں دن دال کا ہوتا ہے، گوشت عید کے عید وہ بھی کوئی دے گیا تو ٹھیک ورنہ منہ تکتے رہو۔''

پروین نے اپنے بیٹے کو چھاتی سے لگاتے ہوئے دوسری چارپائی پر لٹایا تھا۔ کڑی بنانے کے لیے لسی جانی گجر کے گھر سے مل جاتی۔ دوپہر کو تنور کی روٹی کے ساتھ لسی میں نمک ڈال کر سالن کا کام لیا جاتا جو لسی بچ جاتی وہ رات میں کڑی بنانے کے کام آجاتی تھی۔

بادل گرج رہے تھے اور کچے کوٹھے کے اندر مولوی اسلامو کا دل تڑپ رہا تھا اپنی غربت پر۔ ساون کی جھڑی تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ جمعرات کی جھڑی تھی کبھی ہلکی اور کبھی تیز رُک نہیں رہی تھی۔

''مولوی جی......! یہ امامت شامت چھوڑو یہ کچا کوٹھا بیچ دو لاہور چلتے ہیں وہاں پارشید آپ کو فیکٹری میں لگوا دے گا۔''

پینو نے مولوی اسلامو کی طرف دیکھ کر کہا جو اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کو تھامے ہوئے تھا۔ مولوی اسلامو کے جسم کا بایاں حصہ پولیو کی وجہ سے کمزور اور ٹیڑھا تھا۔ وہ چل تو سکتا تھا مگر لنگڑا کر جس کی وجہ سے لوگ اُسے مولوی لنگڑا بھی کہتے، کچھ بدتمیز لونڈے مولوی ڈانسر بھی کہتے تھے۔

مولوی اسلام دین امام مسجد تھا، وہ بھی کلخانہ گاؤں کی جامع مسجد کا۔ پورا محلّہ کھاتے پیتے لوگوں کا پھر بھی مولوی اسلامو کا کوٹھا کچا ہی تھا۔

''چھوٹے چوہدری صاحب......! نماز پڑھا کرو۔'' ایک دن مولوی صاحب نے چوہدری ظہور سے کہا تھا۔

''مولوی تجھے کس کام کے لیے رکھا ہے، تو نمازیں پڑھ، بانگیں دے۔ یہ جو مسجد پر پچیس تیس لاکھ لگائے ہیں، سب محلے والوں نے، تُو اس مسجد کا کرتا دھرتا ہے جو مرضی کر......!'' چوہدری ظہور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''مولوی جی......! میں تم سے کچھ بک رہی ہوں، تم پتہ نہیں کہاں کھوئے ہو، چھوڑو یہ امامت کوئی کام شام کرو۔'' پینو نے سخت لہجے میں کہا۔ مولوی اسلام دین اپنے خیالوں میں گم تھا۔ مولوی نے پروین کی بات سن کر جواب دیا:

''امامت تو ویسے ہی چھوٹ جائے گی، ممبر خلیل ہاتھ میں فتویٰ لیے گھوم رہا ہے سارے پنڈ میں کہتا پھر رہا ہے معذور مولوی کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔'' مولوی اسلام دین نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''تو کیا ممبر خلیل تمھاری جگہ مولوی لگنا چاہتا ہے۔'' پینو نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے فکرمندی سے پوچھا تھا۔

''وہ جامع مسجد میں مولوی نہیں لگ سکتا، وہ دوسرے فرقے کا بندہ ہے پر مجھے ضرور فارغ کروا دے گا۔''

''تم نے بھی مولوی جی......! ہر ایک سے ویر (دشمنی) ڈالا ہوا ہے، بھلا کیا ضرورت تھی اسپیکر میں اُن کے فرقے کو گالیاں دینے کی۔'' پینو نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''کافر کو کافر نہ بولوں، مرتد ہو گئے ہیں دوسرے محلے والے، سب کچھ چھوڑ بیٹھے ہیں۔ ناختم نانیاز ایک دم شودے کمینے کہیں کے۔'' مولوی اسلامو چارپائی سے اُٹھتے ہوئے بولا۔ اُس کے چہرے پر غصہ نمایاں نظر آ رہا تھا وہ لنگڑاتے ہوئے اپنے کچے کوٹھے کے دروازے پر گیا، بارش زوروشور سے جاری تھی۔

''پھر کیا سوچا مولوی جی......!'' پینو ہولے سے بولی رُک رُک کر۔

''پینو دماغ نہ کھا میرا، سوچ تجھے پتہ ہے میں کام نہیں کر سکتا ایک ہاتھ اور ٹانگ سے کام نہیں ہوتا ویسے بھی ابّا گاؤں سے جانے نہیں دے گا۔''

''ابّے کا کیا ہے، اپنا کوٹھا تو پکا کر لیا اور ہمارا چھوڑ دیا۔'' پینو شکوے کے انداز میں بولی۔

''نا ابّا کیوں بناتا ہمارا کوٹھا تو نے ہانڈی جو وکھری کر لی اماں سے، دو ہی جی ہیں اماں اور ابا، پر تو اُنھیں بھی دیکھ نہ سکی۔'' مولوی اسلامو چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''سلمٰی نے بھی طلاق اس بڈھے اور بڈھی کی وجہ سے لی تھی۔ تمھارا ساتھ چھوڑ کر اچھی رہی ہے۔ اب کامونکی میں رہتی ہے، گھر والا فروٹ کی ریڑھی لگاتا ہے۔ فروٹ کھا کر سوتی ہے، کیا ہوا اُس کا گھر والا پندرہ بیس سال بڑا ہے۔ میرے لیے بھی باگڑیاں سے مٹھو ویلڈر کا رشتہ آیا تھا پر میری مت ماری گئی تھی جو میں نے انکار کر دیا۔ بھابھی باوی نے بڑا سمجھایا: ''پینو دفعہ کر مولوی کو، مولوی ہے تو گورا چٹا پر تیرے نصیب کالے ہو جائیں گے کیا ہوا مٹھو ویلڈر کالا دوس ہے چار پیسے کماتا ہے چٹی چمڑی سے پیٹ نہیں بھرتا۔'' پینو نے اپنے آنسو صاف کیے۔ مولوی اسلامو اُٹھا اور پینو کے ساتھ بیٹھ گیا چارپائی پر اس کا ہاتھ پکڑ کر پیار سے بولا:

''دیکھ پینو......! ہمارے حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔''

''مولوی جی......! بیس من گندم اور بیس من مونجی سے حالات ٹھیک نہیں ہوتے۔''

''دو ہزار مہینہ بھی تو دیتے ہیں۔'' مولوی اسلامو نے یاد کرایا۔

''مولوی جی 2015ء میں دو ہزار مذاق لگتا ہے۔'' پینو نے دُکھی آواز میں کہا۔

''آج کھنڈی عیسائی کی بیوی ملی، بتا رہی تھی اب وہ لوگ بھی اپنے کچے مکان پکے بنانے والے ہیں۔ اس کے بعد سارے پنڈ میں ہمارا گھر کچا رہ جائے گا۔ تمھاری مسجد کی کمیٹی تیس لاکھ مسجد پر لگا سکتی ہے، اپنے امام کو تین ہزار بھی نہیں دے سکتی کہ وہ اپنا کچا کمرہ ہی پکا کر لے۔''

''کمیٹی والے کہتے ہیں یہ مسجد کے پیسے ہیں اس میں سے نہیں دے سکتے۔'' مولوی اسلام دین نے تفصیل بتائی۔

’’بھوکے ننگے تھوڑی ہیں اُس محلے والے، سارے پنڈ کے تگڑے لوگ اُسی محلے میں رہتے ہیں، گھر پرتی (فی کس) دو ہزار بھی دیں تو ہمارا کچا کوٹھا پکا بن جائے گا۔‘‘ پینو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

’’پر... دے کون......؟ چھ مہینے بعد فصل پر گندم اور مونجی دیتے ہوئے موت پڑتی ہے، دو ہزار دے دیں۔‘‘ مولوی اسلام دین نے غصے سے کہا۔

’’اللہ کی قسمیں......! اگر میرا بازو اور ٹانگ ٹھیک ہوتے تو میں کب کا کوئی دوسرا کام کر لیتا۔‘‘ یہ کہتے ہوئے مولوی اسلام دین کی آواز میں درد اور آنکھوں میں نمی تھی۔

’’مولوی جی......! مجھ سے پوچھو تو سارا قصور تم مولویوں کا ہی ہے، تیس سال پہلے تو تم پولیو کے قطرے نہ پی سکے اور اب اپنے بچوں کو بھی نہیں پینے دیتے۔ بکری، مرغی گواچنے (گم ہونے) کا اعلان مسجد میں کر دیتے ہو پر پولیو والوں کا اعلان نہیں کرتے۔‘‘

پینو نے چارپائی سے اُٹھتے ہوئے کہا پرات اُٹھائی جو کہ پانی سے بھر چکی تھی۔ اُس نے دروازے میں کھڑے ہو کر پانی باہر پھینکا اور خالی پرات پانی ٹپکنے کی جگہ پر رکھ دی اور خود اپنے بیٹے کے ساتھ لیٹ گئی۔

’’یہ اس مسجد والے مارتے پھرتے ہیں پولیو والوں کو، ہر جگہ تباہی مچا دی ہے اس فرقے نے اور بدنام ہم سارے مولوی ہوتے ہیں۔‘‘ مولوی اسلام دین نے اپنے گھر کے پاس والی مسجد کی طرف اشارہ کیا تھا۔

’’مولوی جی......! اللہ ایک، اُس کا رسول ایک، قرآن ایک، تم مولوی پھر بھی ایک نہیں ہوتے۔ ایک دوسرے کو کافر کہتے رہتے ہو۔ تمھیں پتہ ہے مولوی جی اس مسجد والا مولوی جنید وہ وڈی (بڑی) پگ والا اس عید پر سارے محلے میں گوشت دے کر گیا صرف ہمارے اور چاچے کے گھر گوشت نہیں دیا۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا، کہہ رہا تھا یہ دو گھر مشرکوں کے ہیں شرک کرتے ہیں۔ بدعتی ہیں یہ لوگ...... دسویں فیل ہی سہی مجھے سمجھ نہیں آئی میں نے کون سا شرک کیا ہے اور یہ مولوی جنید ساتھ والی ماسی بتا رہی تھی کہ وہ دو تین جماعتیں ہی پڑھا ہوا ہے پھر بھی فتوے دیکھو مسلمانوں کو مشرک بنا رہا ہے۔‘‘

’’یہ سارا محلّہ مرتد ہو گیا ہے، بے ادب گستاخ...... وہ اونچی مسجد والے وہ تو تھے ہی بھٹکے ہوئے گمراہ لوگ دین سے دور اب اس محلے کا بھی بیڑا غرق ہو گیا ہے۔‘‘ مولوی اسلام دین کی آنکھوں میں انگارے تھے۔ وہ غربت کی آگ تھی یا تفرقے کی...... تھی آگ ہی۔

’’اونچی مسجد والا حافظ اختر جب جی چاہتا ہے ہمارے مسلک کے بارے میں بکواس کرتا ہے۔ اُسے کوئی کچھ نہیں کہتا۔‘‘ مولوی اسلام دین نے گھن گرج سے کہا، پھر جواب بھی خود ہی دے دیا۔

’’وہ کہہ سکتا ہے...... اُس کے پیچھے کشمیریوں کا ہاتھ ہے...... ایک ہماری مسجد والے سب ڈرپوک، بزدل کہیں کے...... نا خود حافظ اختر کو جواب دیتے ہیں نہ مجھے دینے دیتے ہیں۔‘‘

''اونچی مسجد والے حافظ اختر کو کیا دیتے ہیں؟'' پینو نے پوچھا۔

''ایک ایکڑ زمین دی ہے کاشت کرنے کے لیے......شماہی (چھ ماہ) پندرہ سے بیس ہزار کی فصل بیچ لیتا ہے خرچے نکال کر۔'' مولوی اسلام دین نے کرخت لہجے میں جواب دیا تھا۔

''اور اس مسجد والے اپنے مولوی کو کیا دیتے ہیں؟''

''چھ ہزار مہینہ...... پر اس مولوی کی پوری تنخواہ بچ جاتی ہے......ساری تنخواہ بھکر اپنے گاؤں بھیج دیتا ہے......کھانا نمبردار کے گھر سے آجاتا ہے۔'' مولوی اسلام دین نے رشک سے بتایا۔

''پر ہے تو بیوی بچوں سے دور ہی......مولوی جی تم اور حافظ اختر ٹھیک ہو۔ اپنے بیوی بچوں کے پاس اپنے پنڈ میں۔'' مولوی اسلام دین کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری اور کہنے لگا:

''حافظ اختر کے کیسے بچے......ویسے دم درود کے خلاف بولتا ہے اور خود تعویذ لے کر آیا ہے اولاد کے لیے......پر رہے گا نامراد ہی۔''

''نا......نا مولوی جی......! ایسی باتیں نہیں کرتے......اللہ اس کی بیوی کی بھی گود بھر دے......اُس بھاگن کو بھی اولاد کی خوشی نصیب ہو۔'' پینو نے دعا دی محبت سے......خلوص سے......اپنے بیٹے کا ماتھا چومتے ہوئے۔

''ایک نمبر کا منافق ہے......اور تم دعائیں دے رہی ہو۔'' مولوی اسلام دین نے سخت لہجے میں کہا۔

''مولوی جی......! مجھے سمجھ نہیں آتی تم سب مولوی ایک دوسرے کے اتنے خلاف کیوں ہو......سب کے سب غریب چھ ہزار سے اوپر کسی کی تنخواہ نہیں اور دشمنی سات پشتوں تک کرتے ہو وہ بھی بغیر وجہ کے۔'' پینو نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ مولوی اسلام دین نے دیکھا تو حیرت سے پوچھا:

''کیا یاد آ گیا تجھے آدھی رات کو؟''

''پا رشید کو جس دن اپنا بٹیرہ لڑوانا ہوتا وہ صبح ہی بھابھی باوی کو بول کر جاتا اسے کچھ کھلانا مت......بھوکے بٹیرے زیادہ لڑتے ہیں۔ وہی حال مولویوں کا ہے......سارے فرقوں کے مولوی مرتے بھوکے ہیں پر لڑنے سے باز نہیں آتے......ایک دوسرے کو کافر، مرتد، مشرک، گستاخ سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں......تنخواہ کا حساب لگاؤ تو سب کی چھ ہزار نکلے گی۔''

''اب ایسی بات بھی نہیں ہے......میرا دوست ہے قاری شبیر ساتھ والے گاؤں میں امام مسجد ہے......اُسے ہر ماہ اجمل باجوہ سعودی عرب سے پورے آٹھ ہزار روپے اس کے اکاؤنٹ میں بھیجتا ہے۔'' مولوی اسلام دین نے تفاخر سے بتایا۔

''بڑی چھال (چھلانگ) ماری مولوی جی......! چھ ہزار سے سیدھا آٹھ ہزار تک......ہاں یاد آیا وہ تمھارے ویزے کا کیا بنا؟'' پینو نے طنز سے کہا۔

فٹے منہ حافظ عدیل تیرا اُس وقت سیاپا (مصیبت) ڈالا ہوا تھا......مولوی صاحب جلدی سے اپنی تصویریں اور پاسپورٹ کی کاپی بھیج دو......اب کہتا ہے مولوی صاحب داڑھی چھوٹی کروا کر نئی تصویریں بھیجو۔ یہاں پر مولویوں کی داڑھی چھوٹی چھوٹی ہوتی ہے۔''

''مولوی جی پاسپورٹ پر جو چار ہزار لگا ہے وہ میں نے بھابھی باوی سے اُدھار پکڑا، اس فصل پر واپس دینے کا وعدہ ہے جس طرح بارشیں ہو رہی ہیں لگتا ہے چاول کی فصل ویسے ہی گل جائے گی۔ مولوی جی کہیں سیلاب ہی نہ آ جائے۔'' پروین نے فکرمندی سے کہا۔

''اللہ کرے ہڑ (سیلاب) آ جائے سب کی فصلیں بہہ جائیں۔ علامہ اقبال نے صحیح کہا تھا:

جس کھیت سے مولوی کو میسر نہ ہو گندم

اس کھیت کو بہا دو......''

''مولوی جی اب شعر بھی غلط پڑھ رہے ہو۔''

''تو......صحیح پڑھ دے پینو بیگم......!'' مولوی اسلام دین نے طیش سے کہا۔

''اگر میں اس قابل ہوتی تو اس کلخانہ پنڈ میں تمھارے ساتھ نہ ہوتی۔''

''تو کر لیتی مٹھو ویلڈر کے ساتھ شادی۔'' مولوی اسلام دین نے اپنی بیوی کو طعنہ دیا۔

مولوی اسلام دین دیکھنے میں بہت خوب صورت تھا۔ کالے سیاہ گیسو، سفید رنگت، نورانی چہرہ، اسی خوبصورتی کی وجہ ہی سے پروین نے مٹھو ویلڈر کی بجائے مولوی اسلام دین سے شادی کی تھی۔

''مولوی جی میں اپنے کامی کو مولوی کبھی نہیں بننے دوں گی۔''

''پینو......پینو......تجھے ہزار دفعہ کہا ہے کامی مت کہا کر اس کا نام کامران اسلام ہے پورا نام لیا کر۔''

''مولوی جی آپ جو پینو......پینو کرتے رہتے ہو میرا نام بھی پروین سلطانہ ہے۔''

''تجھے تو شروع ہی سے تیرے گھر والے پینو کہتے ہیں۔''

''مولوی جی......! تم تو پروین کہا کرو۔ تمھارا نام اسلام دین ہے سارے لوگ مولوی اسلامو کہتے ہیں کئی تو مولوی لنگڑا بھی کہتے ہیں۔ میری زبان جل جائے اگر مولوی جی کے علاوہ کبھی اس میں سے کچھ نکلا ہو۔'' پروین نے شکوہ کیا۔ مولوی اسلام دین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھری۔ اس نے پروین سے آنکھیں چار کیں۔

''پروین سلطانہ......! غصہ تھوک دو، کامران سویا ہوا ہے تم آ جاؤ میری چارپائی پر۔''

پروین مسکراتے ہوئے مولوی اسلام دین کے ساتھ لیٹ گئی۔

اسلام دین اور پروین ڈھیلی چارپائی پر سیدھے لیٹ گئے چھت کی طرف منہ کر کے اور اپنے کچے کوٹھے کی ٹپکتی ہوئی چھت کو

دیکھنے لگے۔اُن دونوں کا غصہ وقتی طور پر ٹھنڈا ہو گیا۔وہ غصہ جو غربت کی وجہ سے اُن دونوں کی شخصیت کا حصہ بن گیا تھا۔

''اللہ بہتر کرے گا......ان شاءاللہ اگلی برسات سے پہلے ہم اپنا کچا کوٹھا پکا بنالیں گے۔'' مولوی اسلام دین نے چھت سے ٹپکتے ہوئے پانی کو دیکھ کر پروین کو تسلی دی۔تھوڑی دیر وہ دونوں بچوں کی طرح ایک دوسرے کو پانی ٹپکنے والے مقامات کی نشاندہی کرواتے رہے۔

''اب تم کامران کے ساتھ جا کر سو جاؤ۔'' مولوی اسلام دین نے کروٹ لیتے ہوئے کہا۔پروین اٹھی اور اپنے بیٹے کے ساتھ جا کر سوگئی۔

رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔بارش ہلکی ہو چکی تھی۔مولوی اسلام دین اور پروین کچے کوٹھے میں سو گئے۔فجر کی اذان دینے کے لیے جب ہومیو پیتھک ڈاکٹر سعید چھتری لے کر گھر سے نکلا۔مولوی اسلام دین کی گلی میں سے گزرتے ہوئے وہ زور سے چیخا......چلّایا......کوٹھا گر گیا۔مولوی اسلامو کا کوٹھا گر گیا......گر گیا۔ڈاکٹر سعید روتے ہوئے چیخ رہا تھا کہاں مر گئے ہو محلے والوں۔مولوی اسلامو کا کچا کوٹھا گر گیا......

مولوی اسلامو کا کچا کوٹھا......

دل کے قصّے میں

”دل کے قصے میں ہماری پھر سے ہار ہوئی

ایسا کئی بار ہوا ہمیشہ ہر بار ہوئی

کیسا لگا میرا شعر؟“ سید کاشف امین نے پوچھا اپنے سامنے بیٹھے ہوئے روحان حیدر کیانی سے۔

روحان نے مسکراتے ہوئے اپنے ابرو کو جنبش دی اور کہا:

”تمھارے جیسا ہی ہے۔“

”کیانی صاحب میں تم سے ملنے آیا ہوں وہ بھی اتنی سردی میں اور تم ہو کہ اس پینٹنگ میں بزی ہو۔ ویسے ایک خبر ہے تمھارے لیے، مجھے پھر محبت ہو گئی ہے۔“

روحان نے کاشف کی بات سن کر ہنسنا شروع کر دیا، روحان جیسا بندہ جو کہ ہنسنے کے معاملے میں انتہائی کنجوس تھا وہ اُس دن زور زور سے ہنس رہا تھا۔

”پچھلے دس سال میں غالباً چھ سات دفعہ تم یہ اعزاز حاصل کر چکے ہو۔“ روحان نے ہنستے ہوئے کاشف کا ٹریک ریکارڈ اُسے بتایا۔

”اس بار سچی محبت ہے۔“ کاشف نے اپنی نیت بتائی۔

”کیا محبت بھی جھوٹی ہوتی ہے؟ سید کاشف مجھے یاد ہے تمھیں چودہ سال کی عمر میں پہلی محبت ہوئی تھی اور آج دس سال بعد چھٹی یا ساتویں بار یہ گولڈ میڈل تم نے پھر حاصل کیا ہے۔“

”یہ فائنل ہے... ہفتہ پہلے فلائٹ میں اُس سے ملاقات ہوئی، مجھے ارفع اچھی لگی تھی، تیسری ملاقات میں اُسے دل کی بات کہہ دی۔ کل ممی پاپا کو اُن کی طرف بھیج دیا وہ بھی ایکسپوٹر ہی کی بیٹی ہے۔ آسٹریلیا میں پڑھتی تھی اپنی اسٹڈی مکمل کر کے لوٹی ہے۔ ارفع کے ڈیڈی پہلے سے پاپا کو جانتے ہیں۔ انھوں نے فوراً ہاں کر دی۔“ کاشف نے اچھے ٹی وی رپوٹر کی طرح ساری رپورٹ دی۔

”کاشف تم نے ہمیشہ دماغ سے محبت کی ہے، تم محبت نہیں معیار دیکھتے ہو۔ خوب صورتی کا معیار پھر خاندانی رتبہ، مقام اگر وہ لڑکی تمھارے معیار پر پوری اُتر جائے پھر تمھاری شرطیں شروع ہو جاتی ہیں۔ محبت عقل سے عقل والوں کے ساتھ نہیں کی جاتی بلکہ محبت دل سے دل رکھنے والوں کے ساتھ ہو جاتی ہے۔“ روحان نے سنجیدگی سے کہا۔

''بھائی صاحب! آپ والی محبت صرف کتابوں میں ملے گی۔ حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ چھ بار کا تجربہ ہے۔ تین لڑکیوں نے مجھے صرف اس لیے چھوڑ دیا کہ اُنھیں مجھ سے امیر اور اچھے لڑکے مل گئے تھے۔'' کاشف نے افسردگی سے جواب دیا۔ روحان مسکرایا اور بولا:

''دو دفعہ تو تم نے بھی گھر والوں کو خودکشی کی دھمکی دی تھی، ایک دفعہ نیند کی گولیاں بھی کھا لیں تھیں، وہ کیا تھا؟''

''چھوڑو... دفعہ کرو پرانی باتیں... تم چائے کا بولو ساتھ کچھ کھانے کو بھی ہو۔''

کاشف نے مزید شرمندگی سے بچنے کے لیے جلدی سے بات بدل دی۔

روحان اور کاشف بچپن کے دوست تھے۔ روحان کے ابا کارگل کی جنگ میں شہید ہو گئے تھے۔ اس کی ماں مرے کالج سیالکوٹ میں اردو کی پروفیسر تھیں، روحان کی ماں نے دوبارہ سہاگن بننے کے بجائے شہید کی بیوہ رہنے کو ترجیح دی، روحان بڑا تھا اُس سے چھوٹی ایک بہن تھی۔

کاشف کا تعلق ایک بڑے خاندان سے تھا۔ وہ مالی اور افرادی قوت سے مالا مال تھا۔ کاشف کے خاندان میں رشتہ داری اور تعلق داری، مالی نفع نقصان دیکھ کر کی جاتی تھی۔

کاشف کے باپ نے یہ رشتہ بھی بزنس ڈیل کی طرح ہی کیا تھا۔ کاشف اپنے باپ کی تین فیکٹریوں میں سے ایک دیکھتا تھا۔ اس کے برعکس روحان ایک مشہور پینٹر بننا چاہتا تھا، وہ NCA سے حال ہی میں پاس آؤٹ ہوا تھا۔

روحان نے برش اور پینٹ پلیٹ رکھی اور کمرے سے چلا گیا، کاشف اس پینٹنگ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا جو کہ روحان بنا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد روحان ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔

''ماں جان نے پہلے ہی چائے بنا دی تھی۔'' روحان نے ٹرے رکھتے ہوئے کاشف کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔

''یہ تصویر تو کسی لڑکی کی ہے!'' کاشف نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں!'' روحان نے پرچ کپ کاشف کو تھماتے ہوئے مختصر سا جواب دیا اور اپنی چائے پینے میں مصروف ہو گیا۔ اس کی نظریں پینٹنگ پر ٹکی ہوئی تھیں اور کاشف کی اُس کے رخسار پر۔

''سیدھی طرح کہو بھابھی کی تصویر بنا رہے ہو۔'' کاشف جانچتی نگاہوں سے روحان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''روحی چوہدری بھی تو لڑکی ہی ہے۔'' روحان نے سنجیدگی سے کاشف کو بتایا۔

''اور وہ لڑکی تمھاری منگیتر بھی تو ہے۔''

''تو؟''

''ہماری فیکٹری والی مسجد کے مولوی صاحب بتا رہے تھے، تصویریں بنانے والے جہنم میں جائیں گے۔'' کاشف نے مولوی

صاحب کی جمعہ کی تقریر سے اقتباس سنایا۔

''اس جمعہ مولوی صاحب سے پوچھنا ''سلفی'' بنانے والے بھی اُس میں شامل ہیں یا پھر صرف پینٹرز ہی کو دوزخ میں جانا ہے؟'' روحان چائے ختم کر کے اپنا برش پکڑتے ہوئے کہا۔

''سنس آف ہیومر تو تمھارا بچپن ہی سے بہت اچھا ہے۔'' کاشف بھی چائے ختم کر کے روحان کے پاس کھڑا ہو گیا۔

''تم نے رنگوں کی مدد سے اپنی محبت کو اس پینٹنگ میں قید کر لیا ہے۔'' کاشف کی بات میں تعریف کم اور شرارت زیادہ تھی۔

''سید کاشف! محبت رنگوں کی قید سے آزاد ہے۔'' روحان نے پینٹنگ پر اسٹروک لگاتے ہوئے جواب دیا۔

''کچھ بھی کر لو یہ لڑکیاں کسی قید کو نہیں مانتیں۔ یہ سیدھی نہیں ہو سکتیں، یہ ٹیڑھی ہی رہیں گی۔'' سید کاشف نے اپنا دکھڑا رو دیا۔

''کیوں کرنا چاہتے ہو لڑکیوں کو قید؟'' روحان نے بغیر دیکھے پوچھا۔

''چلو سیدھی ہی ہو جائیں۔'' کاشف نے دوسری خواہش بتا دی۔

''سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ ٹوٹ جائیں گی مگر سیدھی نہیں ہوں گی۔ اللہ رب العزت نے عورت کو پسلی سے پیدا کیا ہے۔ پسلی ٹیڑھی تھوڑی ہے۔ وہ تو کمان ہے۔ عورت بھی کمان ہی کی طرح ہے۔ زندگی کی جنگ میں بچاتی بھی ہے اور مرواتی بھی ہے، اگر یہ کمان حیا کی رسی سے بندھی رہے تو سید کاشف! اسے سیدھا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

روحان نے برش رکھا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر اپنے دونوں ہاتھوں کو بغلوں میں دبا کر کھڑا ہو گیا اور اپنی تخلیق کو دیکھنے لگا۔

بھنویں ایسی جیسی کمان ہوں... نظریں تیر جیسی... گال ایسے جیسے دہکتے انگارے... گھٹا گھنگور جیسے گیسو... شربتی نین... موتیوں کی طرح چمکتے دانت... یہ سانولی سالونی اور نمکین لڑکی روحی چوہدری کی تصویر تھی۔

روحی چوہدری دبنگ لڑکی تھی۔ اُس نے خود روحان سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب روحان NCA میں پڑھتا تھا اور روحی چوہدری پنجاب یونی ورسٹی کے اولڈ کیمپس میں پڑھتی تھی۔ روحی چودھری اور روحان حیدر کیانی آپس میں خالہ زاد تھے۔ روحی روحان کی سب سے بڑی خالہ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ روحان ہاسٹل میں رہتا تھا اور کبھی کبھار اپنی خالہ کی طرف سمن آباد چلا جاتا، روحان کے دل میں کبھی بھی روحی کے لیے کوئی ایسا جذبہ نہیں تھا۔ اس کی وجہ شاید روحی کی بے باک، بے مہار اور بے ہنگم قسم کی شخصیت تھی۔

ایک دن روحان کی خالہ نے سمن آباد اُسے اپنی طرف بلایا۔ سردی کی آمد آمد تھی رات کا کھانا کھانے کے بعد روحان چھت پر کبوتروں کے ڈربے کے پاس سگریٹ سلگائے کھڑا تھا۔ وہ خالہ اور خالو کے احترام کی وجہ سے چھت پر سگریٹ پینے چلا آیا، روحان اپنی سوچوں میں کھویا ہوا تھا۔ تب روحی چھت پر چلی آئی۔

''پینٹر بابو! کن سوچوں میں گم ہو؟'' روحی دو فٹ پیچھے کھڑی ہو کر بولی۔ روحان واپس مڑا تو چائے کے مگ گرتے گرتے بچے

تھے جو کہ روحی کے ہاتھوں میں تھے۔

''ماما نے کہا چائے اوپر ہی لے جاؤ۔'' روحی نے چائے پکڑاتے ہوئے کہا۔

دونوں چپ چاپ چائے پیتے رہے۔ چائے ختم کرنے کے بعد روحان بولا:

''میں چلتا ہوں۔'' روحان نے نیچے جاتی سیڑھیوں کی طرف قدم اٹھائے ہی تھے، روحی کے تین لفظوں نے اُس کے قدم روک دیے۔

''آئی لو یو۔''

روحان نے پلٹ کر روحی کی طرف دیکھا۔

''بچپن سے محبت کرتی ہوں تمھیں۔'' روحی بے باکی سے بول رہی تھی۔ روحان کے چہرے پر حیرت تھی۔

''ایسی ہی ہوں میں۔ تم تو کبھی نہ کہتے یہ سب... اس لیے میں نے ہی کہہ دیا ہے۔'' روحی نے محبت کا اظہار ایسے کیا جیسے حکم سنایا ہو۔ روحان تھوڑی دیر تک اُس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد پلٹا جانے کے لیے۔ روحی نے بڑھ کر روحان کی کلائی پکڑ لی۔

''میجر کے بیٹے ہو کر بھی... تم تو بہت ہی ڈر پوک ہو۔''

''میجر کا بیٹا بزدل ہو تو کوئی بات نہیں مگر اُسے بے حیا نہیں ہونا چاہیے۔'' روحان نے کلائی چھڑاتے ہوئے جواب دیا۔

''محبت کا اظہار ہے، بے حیائی تھوڑی ہے!'' روحی نے روحان سے آنکھیں ملاتے ہوئے اپنی صفائی دی۔

''حیا کو بے باکی دھکا مار دے تو... وہ بے حیائی بن جاتی ہے۔''

''اس بے باکی پر اپنی محبت کی چادر ڈال دو۔'' روحی چوہدری دیدہ دلیری سے بولی۔

''میری چادر میں گزرے دنوں کی چند یادیں لپٹی ہیں۔'' روحان نے کھوئی کھوئی آواز کے ساتھ جواب دیا۔

''اُن یادوں کی رہائی کا وقت آ گیا ہے۔'' روحی نے روحان کا ہاتھ تھامتے ہوئے محبت سے کہا۔

''روحی!'' روحان نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالی اور سگریٹ جلایا اور لمبا کش لگا کر بولا:

''سارا گیلانی میری کلاس فیلو تھی۔ NCA جوائن کرنے کے تیسرے دن سے لے کر تین سال تک ہم اکٹھے رہے۔ وہ اکثر مجھے کہتی تھی: روحان اگر تم مجھے نہیں ملے تو میری روح نکل جائے گی۔ سارا کی روح تو نہیں نکلی... وہ ضرور اپنے ہسبینڈ کے ساتھ لندن کو نکل گئی۔ اُس نے شادی کرنے کی وجہ بتائی نہیں اور میں نے پوچھی نہیں۔ آپ تو خود ہی روح... ہی... ہیں۔''

روحان نے پرانی یادوں کا دریچہ بند کیا سگریٹ کو دیوار کے ساتھ ملیا میٹ کیا اور وہاں سے چلا گیا۔ چند دنوں کے بعد روحان کی ماں نے اُس سے رائے طلب کی کہ اگر اُس کا رشتہ روحی سے کر دیا جائے تو اُسے کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟

''روحان بیٹا! آپا، روحی کے رشتے کو لے کر بہت پریشان ہیں، انھوں نے خود مجھ سے اس سلسلے میں بات کی تھی۔ روحی کو تو تم

بہت پسند ہو۔" روحان نے حیرانی سے اپنی ماں کو دیکھا اور کہا:

"ماں جان آپ! کیا آپ اُس لڑکی کے ساتھ رہ سکتی ہیں؟" روحان کی ماں نے کچھ دیر سوچا پھر بولیں:

"تھوڑی بدلحاظ ہے...اور..."

"اور یہ کہ آپ اپنی بہن کی محبت میں یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ روحی کو اپنی بہو بنا لیا جائے۔ ماں جان! آپ روحی کے ساتھ نہیں چل سکتیں۔"

"روحان! آپا نے مجھ سے بات کی تھی، میں نے انھیں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں روحان کی مرضی پوچھے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اب تم بتاؤ تمھاری کیا رائے ہے؟"

"پہلے آپ بتائیں آپ کے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟" روحان نے سوال پر سوال کر دیا تھا۔

"دیکھو روحان! اب ایسی بُری بھی نہیں ہے روحی..."

"مطلب آپ فیصلہ کر چکی ہیں؟" روحان نے آگے بڑھ کر اپنی ماں کو گلے لگایا تھا۔

"جیسے آپ کی خوشی...ماں جان!"

روحان حیدر کیانی اب بھی اپنی تخلیق میں کھویا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر تک سید کاشف اُسے دیکھتا رہا۔ پھر واش روم چلا گیا۔ جب وہ واش روم سے لوٹا تو روحان اُسی پوز میں کھڑا تھا۔

"جناب اس پینٹنگ سے باہر نکل آئیں۔"

روحان کی نظریں تو پینٹنگ پر تھیں مگر اس کے ذہن میں یادوں کا میموری کارڈ ON تھا۔

"لگتا ہے بھابھی سے بہت محبت کرتے ہو۔" سید کاشف نے روحان کو چھیڑا۔

"آج ایک سچ بولوں؟" روحان نے ایسے کہا تھا جیسے وہ سید کاشف سے سچ بولنے کی اجازت مانگ رہا ہو۔

"مجھے روحی سے کبھی بھی محبت نہیں رہی، میری محبت تو سارا تھی۔"

"سارا؟ کون سارا؟" سید کاشف حیرت سے بولا۔

"پتہ نہیں...نام تو اس کا سارا گیلانی تھا پر میں یہ نہیں جان سکا کہ وہ کیا تھی...اور کون تھی۔ میں تو روحی کو بھی نہیں جانتا... یہ کون ہے؟" روحان کھویا کھویا بول رہا تھا۔

"میری بات پھر ٹھیک ہوئی نا! کہ لڑکیاں ٹیڑھی ہوتی ہیں۔" سید کاشف عجلت میں بولا۔

"نہیں! لڑکیاں تو پہیلیاں ہیں... پاتال سے گہری...سیپ کے اندر موتی جیسی...کبھی نمکین اور کبھی میٹھی...جسے تم ٹیڑھا پن کہتے

ہو وہ تو اُن کی اصل ہے۔اصل کی نقل تو ہو سکتی ہے اصل کی ساخت نہیں بدلی جا سکتی وہی ٹیڑھا پن، نزاکت اور ادائیں لڑکیوں کی خوب صورتی ہے۔"

"سات دفعہ محبت میں نے کی اور تجربہ تمھارے پاس ہے۔"

"محبت کے کھیل میں کوئی تجربہ کار نہیں ہوتا...سب کے سب اناڑی ہی رہتے ہیں۔"

روحان اٹھا اور اپنا روم اندر سے بند کیا، ایک دراز کو چابی لگا کر کھولا اُس میں سے سگریٹ کی ڈبیا، لیٹر اور ایش ٹرے نکال کر سامنے ٹیبل پر رکھا۔ایک سگریٹ لگا کر سید کاشف کو دیا اور دوسرا اپنے لبوں سے لگایا۔پھر کمرے میں دھوئیں کے غبارے اُڑنے لگے۔

"میں تو ممی پاپا کے سامنے بھی سگریٹ پی لیتا ہوں۔" کاشف نے اپنی عادت بتائی۔

"کچھ عجیب سا لگتا ہے اس طرح سگریٹ پینا...اس سے زیادہ عجیب بات تو یہ ہے کہ ایک شہید آرمی میجر کا بیٹا پینٹر ہو... پتا سب کو ہے کہ میں سگریٹ پیتا ہوں مگر کسی کے سامنے کبھی نہیں، میں اپنی خامیاں اور ناکامیاں چھپانا چاہتا ہوں۔"

"دوستوں سے بھی؟" کاشف نے پوچھا۔

"ہاں! دوستوں سے بھی...سارا گیلانی نے مجھے چھوڑ دیا، یہ بات روحی کے بعد تمھیں بتائی ہے۔"

روحان نے صوفے کے اوپر خود کو دراز کیا۔گردن کی ٹیک لگائی اپنے غم کو دھوئیں کے ذریعے اندر سے نکالا۔

"سید کاشف! میرے لیے بڑی تکلیف کی بات ہے کہ کوئی مجھے چھوڑ دے اور وجہ بھی نہ بتائے...محبت میں ہم دونوں کی مرضی شامل تھی تو جدائی کا فیصلہ وہ اکیلے کیسے کر سکتی ہے؟"

"شادی تم روحی سے کر رہے ہو اور تمھارے دل میں سارا گیلانی ہے۔" سید کاشف کو تشویش لاحق ہوئی۔

"نہیں! روحی مجھ سے شادی کر رہی ہے۔" روحان اوپر کی طرف بند CEILING FAN کو دیکھ کر بولا۔

"سید کاشف! اُس FAN کو دیکھو، تین پر ہیں۔سارے ایک ہی مدار کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔یہ محبت کا مدار ہے اور ہم تینوں تین پَر ہیں، ہم جتنا مرضی تیز گھوم لیں ایک دوسرے کے پیچھے ایک دوسرے کو چھو کبھی نہیں سکتے، یہی حقیقت ہے۔"

"تمھارا پوائنٹ آف ویو میری سمجھ سے باہر ہے، محبت کرنے والے تو محبوبہ کی تصویر بناتے ہیں اور تم نے ہونے والی بیوی کی بنائی ہے۔"

"میری محبوبہ اب کسی کی بیوی ہے! میرے دل نے کہا محبوبہ نے تو وفا نہیں کی، شاید ہونے والی بیوی کرے اس لیے روحی کی تصویر بنائی ہے۔"

"اِف یو ڈونٹ مائینڈ، ایک بات بولوں؟" سید کاشف نے اجازت مانگی۔روحان نے گردن موڑ کر پلکوں کو بند کر کے کھولا۔

''اگر روحی چوہدری بھی سارا گیلانی کی طرح نکلی تو؟'' روحان کے چہرے پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ اُبھری۔اُس نے کہا:

''وہ کیا بے وزن شعر تم نے سنایا تھا؟''

''دل کے قصے میں ہماری پھر سے ہار ہوئی

ایسا کئی بار ہوا ہمیشہ ہر بار ہوئی''

سید کاشف نے جلدی سے اپنا شعر سنایا۔

''سید کاشف اس بار ہماری نہیں صرف تمھاری ہار ہوگی کیوں کہ تمھاری شادی مجھے ایک بزنس ڈیل لگ رہی ہے جو زیادہ دن نہیں چل سکتی۔''

سید کاشف نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا:

''روحان حیدر کیانی! تمھارے بقول ہم لوگ سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں سوائے بزنس میں نقصان کے۔اگر ایسی بات ہوئی تو عمر بیت جائے گی نقصان نہیں اُٹھائیں گے ہم لوگ...تم اپنی بات کرو اس دفعہ دل کے قصے میں اگر تمھاری ہار ہوگئی تو؟''

''اگر اس بار دل کے قصے میں ہار ہوئی تو میں زندگی ہار جاؤں گا۔'' روحان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔اُسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی روحان نے جلدی سے ایش ٹرے، سگریٹ اور لیٹر سب کچھ اٹھایا، روم اسپرے کیا اور سید کاشف کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا اور خود واش روم سے موتھ واش کی کلی کر کے واپس آیا۔روحان کی ماں جان اور اس کی چھوٹی بہن رات کا کھانا لے کر آئی تھیں۔

''آنٹی! آپ ایک میڈ کیوں نہیں رکھ لیتیں؟'' سید کاشف نے جلدی سے مشورہ دیا اس سے پہلے کہ روحان کی ماں کچھ پوچھتیں۔

''کاشف بیٹا! ہم تین افراد ہیں اور ہم تینوں خود اپنا اپنا کام کرنے کے عادی ہیں۔تم کھانا کھاؤ۔'' روحان کی ماں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔اس کے بعد روم سے چلی گئیں۔

روحان اور کاشف کھانے میں مشغول ہو گئے۔اس دوران روحان کے سیل فون پر گھنٹی بجی جو کہ دوسرے صوفے پر پڑا ہوا تھا۔

کاشف نے اُسے بتایا:

''روحان! تمھارا فون بج رہا ہے۔''

''کھانے کے دوران میں کسی کا بھی فون اٹینڈ نہیں کرتا۔''

روحان نے بے پرواہی سے کہا۔اس اثناء میں تین CALLS آئیں۔اُس کے تھوڑی دیر بعد ایک MESSAGE بھی آیا، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سید کاشف چلا گیا تھا۔روحان برتن کچن میں چھوڑ کر لوٹا اُس نے اپنا سیل فون پکڑا، روحی نے تین کالز

کی تھیں۔روحان نے کال بیک کی تو روحی کا نمبر بند ملا۔اُس نے دوبارہ نمبر ملایا،فون بند تھا۔اُس نے میسج چیک کیا وہ بھی روحی ہی کا تھا۔

روحان نے میسج منہ میں پڑھنا شروع کیا۔

"ڈیئر فیانسی! تھینکس تم میرے بہت کام آئے... تمھیں یاد ہوگی پچھلے نومبر کی وہ رات جب تمھیں کھانے پر ماما نے بلایا تھا، دراصل وہ میرے کہنے پر ہوا تھا۔ماما اور پاپا میری جلد سے جلد شادی کرنا چاہتے تھے۔اُنھیں میرے اور شاہ ویز کے ریلیشن شپ کی خبر ہو چکی تھی۔شاہ ویز ہماری گلی کے آخری مکان میں رہتا تھا،اُس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی،میری وجہ سے یا پھر ایسے کہہ لو میرے کہنے پر...اُن دنوں شاہ ویز پاکستان میں تھا۔شاہ ویز کینیڈا میں سیٹل تھا،میں نے اُس سے کورٹ میرج کر لی تھی۔تمھیں ڈنر پر انوائٹ کرنے سے تین دن پہلے میرے گھر والے اس بات سے بے خبر تھے۔مجھے ٹائم چاہیے تھا اس لیے تمھارا انتخاب کیا! میں نے ہی ماما سے کہا تھا تم سے انگیجمنٹ کرنے کے لیے۔اس دوران میرے سارے ڈاکومنٹس کمپلیٹ ہو گئے۔

بڑی ڈرامیٹک اسٹوری لگتی ہے نا؟ بٹ دِس اِز ٹرو میں نے اپنے گولڈ سمتھ کے پاس جانے کے لیے بلیک سمتھ کو استعمال کیا۔

EVERY THING IS FAIR LOVE AND WAR

میں تمھاری سارا گیلانی جیسی تھوڑی ہوں، میں نے جس سے محبت کی اُسی سے شادی بھی کی۔مجھے تمھیں جسٹی فیکشن دینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔بس یہ پروف کرنا چاہتی ہوں میں سارا گیلانی سے بہتر ہوں۔اُس نے تم سے محبت کر کے دھوکہ دیا اور میں نے اپنی محبت کو پانے کے لیے تمھارا استعمال کیا۔سارا بغیر بتائے چلی گئی تمھاری زندگی سے اور میں بتا کر جا رہی ہوں اس وقت میں فلائٹ میں بیٹھی ہوں اپنے ہسبینڈ کے کندھے پر سر رکھ کر تمھیں تین کالز کیں تم نے رسپانس نہیں دیا اس لیے میسج چھوڑ رہی ہوں۔ہمارا جہاز اُڑنے کے لیے ریڈی ہے۔شاہ ویز کے آنے کی کسی کو خبر نہیں ہے اور میری اُس کے ساتھ جانے کی بھی کسی کو خبر نہ ہو۔پلیز...پلیز...پلیز..."

روحان نے روحی کا میسج ڈلیٹ کیا اور موبائل کو اتنی زور سے دیوار پر مارا کہ وہ کرچی کرچی ہو گیا۔روحان سیدھا اپنے بیڈ پر لیٹ گیا اُس نے شدید سردی میں CEILING FAN ON کر دیا اور اُسے دیکھنے لگا۔

صبح جب اُس کی ماں جان روحان کے کمرے میں آئی تو روحان لحاف کے بغیر کھلی آنکھوں سے FAN کو دیکھ رہا تھا۔اُس کی ماں نے پنکھا بند کیا۔

روحان تھا تو اپنے بستر پر...مگر اپنی روح کے بغیر۔روحی کیا...روحان کو چھوڑ کر گئی،روحان کی روح نے بھی اُسے چھوڑ دیا تھا۔

مُنڈا اَفل شریف اَے

''مُنڈا اَفل شریف اَے آپا جی کبرانے (گھبرانے) کی گل کوئی نی.....'' حلیمہ نے بڑی حلیمی سے اپنے بیٹے محبوب عرف مٹھّو کی تعریف میں لمبا چوڑا بھاشن دے ڈالا۔ بھاشن کیوں نہ دیتی مٹھّو کی ہونے والے سسرال میں عزت کا سوال تھا۔

''بہن بُرا نہ منانا میں نے سُنا ہے تمھارے بیٹے کے لچھن ٹھیک نہیں ہیں۔'' بشیراں لڑکی کی ماں نے مٹھّو کے بارے میں ایک اور بشارت سُنا دی۔ رانی نے ترچھی نظر سے بشیراں کو دیکھا تھا۔ غصہ تو اُسے بہت آیا پر بھائی کے رشتے کی خاطر پی گئی۔ وہ جبری تبسم ہونٹوں پے سجا کے بولی:

''ماسی بشیراں! بھائی میرے کی منگیتر مینا، منگنی سے اگلے دن کرنٹ لگنے سے مرگئی۔ اُس کی لکھی ہی ایسے تھی اِس میں بھائی کے لچھن کیسے خراب ہوگئے۔ ماں میری چٹے چاٹّے (سفید بالوں) کے ساتھ جھوٹ تھوڑی بولے گی۔ اُس نے تم لوگوں کو یقین تو دلایا ہے کہ ''مُنڈا اَفل شریف اَے'' تم لوگوں کو ماں میری کی بات پر یقین کرنا چاہیے۔''

یقین ہے تو ہم سگن ڈالنے کے لیے آگئے ہیں نا.....'' لڑکی کی ماسی نذیراں نے اپنی خاردار آواز میں خوشی کی خبر سُنائی۔ یہ سُنتے ہی مٹھّو کی ماں اور بہنوں کی باچھیں کھل گئیں۔

''جلدی بلائیں جی اپنے بیٹے کو ہم نے کاموں کی واپس بھی جانا ہے۔ نیرا (اندھیرا) پڑ رہا ہے۔'' لڑکی کا باپ مشتاق موٹا پکوڑے کھاتے ہوئے بولا۔ حلیمہ نے اپنی بیٹیوں کو اکھیوں ہی اکھیوں میں پوچھا جب خالی آنکھوں میں کوئی جواب نہ پڑھ سکی تو خود ہی بتیسی نکال کر طوطا کہانی سنانے لگی:

''مٹھّو دربار پر سلام کرنے گیا ہے میں نے فون کردیا ہے بس آتا ہی ہوگا۔''

دھماکے سے دروازہ کھلتا ہے۔ ایک لڑکا پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بیٹھے ہوئے مہمانوں سے بے نیاز آ کر FM کے RJ کی طرح نان سٹاپ بولنا شروع کردیتا ہے:

''چاچی! مٹھّو، بلّو کے گھر سے ٹُن ہو کر سنوکر پر آیا اور آتے ہی میچ پر جوا لگا دیا تھا۔ پولیس کی ریٹ پڑی وہ مٹھّو کو اُٹھا کر لے گئی ہے..... چاچی کچھ کر لے، دودھ مکھن، لسی، جو بھی بھیجنا ہے جلدی جلدی بھیج دے۔ سُنا ہے یہ تھانیدار بڑا ہی ڈاہڈہ ہے اگر تو نے دیر کی تو اُس نے مٹھّو کی چھترول کردینی ہے۔'' چھادو نے سانس لی تو نذیراں نے بطخ کی طرح خاردار آواز میں فوراً پوچھا:

"یہ بلّو کون ہے۔"

"بلّو.....متھّو بھائی کی معشوق۔" چھادو نے بغیر تاخیر کے اگلی خبر دی تھی۔

"لکھ دی لعنت چھادو تیری منحوس شکل تے۔" متھّو کی بڑی بہن رانی نے کسی اتھری عورت کی طرح چھادو کو ڈانٹا۔ چھادو رانی کو اچھی طرح سے جانتا تھا اگر وہ چند لمحے وہاں رُک جاتا، متھّو تو تھانیدار کی چھترول سے بچ ہی جاتا مگر چھادو کی رانی کے ہاتھوں دھلائی 100% کنفرم تھی۔

بشیراں نے اپنے شوہر کو اُٹھنے کے لیے کہنی ماری، مشتاق موٹے نے اُٹھتے اُٹھتے بھی پلیٹ میں بچے ہوئے دو پکوڑوں کو ختم کرنا اپنا فرض سمجھا تھا۔ لڑکی والے بیٹھے ہوئے تھے، جو سب اُٹھ گئے۔

"ہم چلتے ہیں۔" بشیراں تلخ لہجے میں بولی۔ رانی نے بشیراں کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا، نذیراں متھّو کی بہنوں رانی اور دانی کے تیور بھانپ گئی تھی۔ مشتاق موٹے کی نظریں اپنی ہی دنیا میں مست تھیں بسکٹ اور پکوڑوں کی پلیٹیں خالی ہو چکی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا پلیٹ میں پڑی ہوئی اِس تھوڑی سی نمکو کا کیا قصور ہے اِسے بھی محفوظ مقام پر پہنچادوں ورنہ یہ باہر پڑی پڑی سلّی ہو جائے گی۔

"ہم یہ رشتہ پکا ہی سمجھیں نا....." دانی نے بشیراں اور نذیراں پر جانچتی نگاہ ڈالی وہ بھی مشتاق موٹے کو اپنے قبیلے ہی سے سمجھ بیٹھی تھی۔

"پکا.....؟" بشیراں پھٹ پڑی۔ نذیراں نے اپنی نظروں کا سہارا لے کر بشیراں کو چُپ رہنے کا ایسے سگنل دیا جیسے موبائل تک موبائل کمپنی کے سگنل بغیر نظر آئے پہنچ جاتے ہیں۔

"پکا جی پکا.....جیسے ہی متھّو پُتر تھانے سے چھوٹتا ہے آپ ہمیں خبر بھجوادیں ہم سگن ڈالنے پہنچ جائیں گے۔" نذیراں کی خرخراہٹ سے بھرپور آواز میں نہ جانے کہاں سے نصیبو لال جیسے سُر فٹ سے آ گئے تھے۔ اِس گفت وشنید کے دوران مشتاق موٹے نے اپنا اُدھورا مشن پورا کر دیا تھا۔ پلیٹ میں بچی ہوئی نمکو اپنے ساتھیوں تک پہنچ چکی تھی۔ لڑکی کے گھر والوں نے تیلی گلی پکڑی۔

"بڑے ہی چنگے (اچھے) لوگ ہیں۔" حلیمہ نے لڑکی کے گھر والوں کے جانے کے بعد اُن کی شان میں تعریفی کلمات ادا کیے تھے۔

"ماں تیری تو ماری گئی ہے مت۔" رانی نے خفگی سے کہا۔ دانی نے یک لخت پوچھا:

"کیوں کیا ہوا.....رشتہ تو ہو گیا ہے۔"

"دانی لسّی کم پیا کر.....ڈرم ہی بنتی جا رہی ہے.....متھّو کا ہو نہیں رہا.....تیرا رشتہ کہاں سے ڈھونڈوں گی۔" رانی یہ بول کر وہاں سے چلی گئی۔

"اب کھانا پینا بھی چھوڑ دوں۔" دانی معصومیت سے بولی۔

☆......☆......☆

شاہدرہ جو کبھی شاہوں کا در ہوا کرتا تھا، اب گوالوں کا گڑھ ہے۔ چودھری مکھن اپنے والدین کا اکلوتا تھا چھوٹی عمر میں حلیمہ سے شادی ہوگئی اور جلد ہی گھر کی آبادی بھی بڑھ گئی، چند سال میں تین بچے بھی ہوگئے۔

چودھری مکھن اپنے نام کی مناسبت سے مکھن کا بہت شوقین تھا۔ ڈاکٹروں کے کہنے کے باوجود مکھن نے مکھن نہیں چھوڑا اس لیے دنیا ہی چھوڑ گیا۔

حلیمہ نے مکھن کے اگلے جہان سُدھارنے کے بعد اپنے میکے نارنگ منڈی میں رانی کی شادی کردی۔ رانی کی شادی کو چند ہی روز گزرے تھے۔ اُس کے خاوند اکمل نے رانی کو کسی بات پر ڈانٹا۔ اُدھر اکمل نے ڈانٹا اور اِدھر رانی نے اُٹھایا شاٹا اور مار مار کر اکمل کو بنا ڈالا کھٹل۔ اکمل ہوگیا چقندر کی طرح لال اور وہ کہنے لگا:

"رانی بی بی تو ڈاہڈی میں ماڑا.....میں نارنگ کا ملنگ اور تو شاہدرہ کی رانی.....تیری میری کہانی آگے نہیں چل سکتی رانی.....تیری بڑی مہربانی.....یہ پکڑ اپنا حق مہر اور میرے گھر سے اُٹھا اپنا قہر.....رہا لحظ کا سوال وہ کرتا ہوں ایک دو دن میں ارسال، تو رکھ اپنے گھر والوں کا خیال اور اپنے ابّے کی سو بھینسیں سنبھال" یہ تھی رانی کی کہانی.....اب باری آتی ہے دانی کی.....نام ہی سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا.....چودھری مکھن کی سب سے چھوٹی نشانی جسے لوگ کہتے ہیں دانی.....دانی کا اردو میں مطلب ہے سیانی.....پر ایسی دانی میں کوئی بات نہیں تھی.....دانی کی Age تو تھی صرف سولہ پر اُسے دیکھ کر پڑ جاتا تھا رولہ.....عورتیں اُسے دیکھ کر کہتیں ہائے ہائے یہ لڑکی ہے یا ٹرالی.....دانی کے سامنے دوسری لڑکیاں لگتی تھیں ہلکی پھلکی بس خالی خالی.....

اب آتے ہیں اِس کے گھر کے منجھلے سلطان یعنی مٹھو پہلوان کی طرف.....آپ سوچ رہے ہوں گے یہ مٹھو کے ساتھ پہلوان کون ہے.....؟ یہ ایک ہی مابدولت ہیں، گھر والے پیار سے مٹھو کہتے ہیں اور یار دوست احترام میں پہلوان.....لنگوٹ اور کھاڑے کو زندگی میں نہیں دیکھا پھر بھی پہلوان ہی ہیں اگر لاہوری ایکسنٹ میں کہا جائے تو پہلے آپ کو اپنے ہونٹ ڈھیلے کرنے پڑیں گے پھر تھوڑا سا گڑ کھانا پڑے گا گڑ نہیں ہے تو چینی بھی چلے گی۔ زبان میٹھی ہوگی اب ڈھیلے ہونٹوں کے ساتھ بولیں "شزادہ پلوان" اب آپ نے کوریکٹ لاہوری ایکسنٹ پکڑا ہے۔

ایکسنٹ کو ماریں جی گولی ہم واپس آتے ہیں اپنی اسٹوری کی طرف.....مٹھو سے دانی چار سالی چھوٹی تھی اور رانی اُس سے تین سال بڑی۔

سو بھینسوں کی دیکھ بھال تو کامے ہی کرتے ہیں پر اُن سب کی نگرانی رانی میڈم ہی کی ذمہ داری ہے۔ اِس گھر میں مردوں کا ہے کال.....اِس لیے مٹھو اِس گھر کا ہے لعل۔ آپ کو پتا ہی ہے رانی نے لے لی تھی طلاق.....اب وہ ہے مشتاق....."مشتاق کس چیز کی.....؟" آپ کے ذہن میں سوال اُٹھا ہوگا۔ بتاتا ہوں.....وہ دیکھنا چاہتی ہے مٹھو کے چہرے پر لڑیاں.....لڑیاں سہرے کی.....مگر وہ آ نہیں رہی

ہیں گھڑیاں، اب سوال اُٹھتا ہے کیوں.....؟

رانی جہاں بھی مٹھو کے رشتے کی بات چلاتی ہے۔ مٹھو کے رشتے سے پہلے اُس کی شہرت وہاں پہنچ جاتی ہے۔ شہرت.....کیسی شہرت..... چھادو نے آپ کو شروع میں مٹھو کی پرسنیلٹی کا تھوڑا سا انٹرو کروایا تو تھا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے سب کا تھوڑا تھوڑا تعارف ہو گیا یہ بلّو کون ہے.....؟ بلّو مٹھو کی محبوبہ گڑوی والی ہے۔ خاوند مر گیا تھا۔ مٹھو نے مکان کرائے پر لے کر وہاں بلّو کو رکھا ہوا ہے۔ بلّو کا اُس کے قبیلے نے کر دیا ہے بائیکاٹ کیونکہ بلّو نے قبیلے کے رولز کی وائلیشن کی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں مٹھو نے بلّو کے ساتھ نکاح کر لیا ہے اور کچھ کہتے ہیں ایسے ہی افواہ ہے۔ کہانی تو گپت ہے جی۔ اُس کا مجھے بھی نہیں پتا۔

اب حلیمہ اور رانی مٹھو کی کرنا چاہتی ہیں شادی جس پر مٹھو نہیں ہوتا راضی۔

''شادی کیسے ہوگی.....؟ مٹھو تو اندر ہے۔'' آپ نے یہی سوچا ہوگا.....نا۔

رانی کی حویلی کے پیچھے ہی پولیس کی چوکی، چوکی کے اندر پانچ کلو مکھن اور دس کلو دودھ جاتا ہے اور مٹھو باہر آ جاتا ہے۔ پولیس والے بھی ہیں بڑے سیانے وہ مٹھو کو اندر کرنے کے ڈھونڈتے رہتے ہیں بہانے۔ اگر کسی پولیس والے کی بیوی کو پڑنا ہو چھلہ تو اُن کا مٹھو سے بڑ جاتا ہے گلہ۔ پولیس والے مٹھو پر بناتے ہیں کیس بہترین تو چوکی میں آ جاتا ہے دیسی گھی کا ٹین، خیر پولیس والوں کو بھی دفعہ کریں جی۔ اب تو اُن کا بھی بدل گیا ہے یونیفارم، شائد اِس سے ہی بن جائے عوام کا کام۔ مٹھو آ گیا جی باہر۔ رانی کی نیت ہے آپ سب پر ظاہر۔ وہ ہر حال میں کرنا چاہتی ہے مٹھو کی شادی۔ چاہے ہو جائے اُس سے کسی کی بیٹی کی بربادی۔

اب ذہن میں آتا ہے یہ خیال کس طرح کسی کی بیٹی کے گلے پڑے گا مکھن کا لعل۔ لعل اپنا مٹھو جی۔

رانی ایک دن اُڑا رہی تھی پتنگ۔ اُسے کسی نے بتایا ایک رشتہ ہے جھنگ۔

رانی نے حلیمہ کو لیا سنگ اور رشتہ کرنے پہنچی جھنگ۔

☆......☆......☆

''مُنڈا اَفل شریف اَے.....'' حلیمہ نے مٹھو کی تعریفوں والا فولڈر کھولا ہی تھا کہ فٹ سے لڑکی کی ماں عطیہ بول پڑی:

''حلیمہ باجی! تمھارا بیٹا شریف ہے تو میری بیٹی شریفاں.....جوڑی نمبر ون ہے جی۔'' میں تو نکّی کا دین نہیں دے سکتی جو آپ لوگوں کو یہاں لے آئی ہے۔'' عطیہ نے اپنی نند پروین کا گھٹنا دباتے ہوئے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ سمجھ یہ نہیں آ رہا عطیہ نکّی کے اتنے گُن کیوں گا رہی ہے۔ مٹھو کو کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں جو نکّی ہی کو نظر آئے ہیں۔ شاید نکّی بھی مٹھو کو ماں کی ہی آنکھ سے دیکھ رہی تھی اسی لیے اُس کے نزدیک بھی ''مُنڈا اَفل شریف اَے۔''

''ہمیں تو فری پسند ہے آپ بھی آ کر مٹھو کو دیکھ لیں۔'' رانی نے فری پر نظریں ٹکاتے ہوئے کہا۔

''لڑکی کی پھوپھی نے لڑکے کو دیکھا ہوا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں وٹ اپ۔''

''وٹس اپ'' فری نے لاج شرم کو وقتی طور پر رکھا سائیڈ پر اور اپنی ماں کو صحیح لفظ بتا کر پھر سے شرمانے لگی۔

''ہاں وہی وٹس اپ آپ بھیج دیں اُسی سے مٹھو کی تصویریں ہم بھی دیکھ لیں گے اور فری بھی۔''

''اپنے مٹھو کو ساتھ ہی لے آتے..... فری اُسے دیکھ تو لیتی۔'' فری نے ہولے سے منہ میں کہا۔ رانی نے فری کی اِس بات کو نوٹس کیا تھا۔ رانی فری کو جانچتی نظروں سے دیکھ رہی تھی اُس لمحے فری نے بھی رانی کو مسکراتے ہوئے اِک نظر دیکھا اور مسکرا کر پھر سے گردن جھکا لی۔ رانی بھی اپنی شادی کے وقت ایسے ہی مسکرائی تھی۔

''منہ میٹھا کرائیں جی۔'' رانی نے رشتے پر رضامندی کی مہر لگا دی۔ رانی سے بھی زیادہ عطیہ کو فری کی شادی کی جلدی تھی۔ منگنی کی بجائے اُنہوں نے دو ہفتے بعد کی شادی کی تاریخ ہی رکھ لی۔

☆......☆......☆

''ماں میں یہ شادی نہیں کروں گا۔'' مٹھو نے اپنا فیصلہ سُنا دیا۔ حلیمہ نے رانی کی طرف دیکھا جیسے رانی کو مٹھو سے جرح کرنے کا حکم دیا ہو۔

''ٹھیک ہے تو پھر میں ماں اور دانی راوی کے پُل سے چھلانگ لگا کر اپنی جان دے دیتے ہیں۔''

''میں راوی کے پُل سے چھلانگ نہیں لگاؤں گی۔'' دانی نے کھیر کا اگلا چمچ کھانے سے پہلے ہی اپنی سٹیٹ منٹ دے دی۔ رانی کا دل چاہا وہ دانی کو خود ہی راوی کے پُل سے دھکا دے دے پر کیا کرتی اُس وقت مٹھو سے نگوشی ایشن جو چل رہی تھیں۔

''اب ماں بہن سے زیادہ تجھے وہ گڑوی والی پیاری ہے۔'' رانی نے اٹیک کی بجائے ایموشنل بلیک میلنگ کا راستہ اختیار کیا تھا۔

''تم لوگوں کو میری محبت سے زیادہ اپنی عزت پیاری ہے۔'' مٹھو نے جذباتی انداز میں ڈائیلاگ مارا تھا اُتنی ہی شدت سے رانی نے بھی اپنی لائنیں بولی تھیں:

''مٹھو پلوان! تجھے اُس گڑوی والی کی محبت تو یاد رہی جس نے صرف ایک بار تجھے اپنے گھڑے سے ٹھنڈا پانی پلایا تھا۔ افسوس اُس ماں کی عزت بھول گئے جس کا دودھ پی کر تم جوان ہوئے ہو اور اُس کا دودھ خون بن کر تمھاری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔''

''بس کر دے رانی..... بس کر دے.....'' مٹھو کے اندر سے سویا ہوا سلطان جاگ اُٹھا تھا۔

''سلطان کون.....؟'' آپ کے دماغ کی گھنٹی بجی نا..... یہ وہ سلطان نہیں جو آپ سوچ رہے ہیں۔ یہ سلطان راہی کی بات ہو رہی ہے جس کی فلمیں دیکھ دیکھ کر مٹھو جوان ہوا ہے۔

''ماں مینو معاف کر دے تو جتھے (جہاں) کہے گی میں اوتھے (وہیں) ہی شادی کروں گا۔'' لو جی مُنڈا فل شریف ہو گیا ہے اب

بلّو کو کون سمجھائے کہ وہ واپس چلی جائے۔ یہ بیڑہ اُٹھایا چھادو نے اِس سے پہلے کے چھادو بلّو سے بات کرتا بلّو خود ہی بول پڑی:

''وے چھادو یہ پھڑ چابی۔ مٹھّو کو بتا دینا میں اِس گھر میں قید نہیں رہ سکتی۔ تم لوگ پتا نہیں ایک ہی تھاں (جگہ) ایک ہی گھر میں کیسے ساری زندگی گزار لیتے ہو..... ہم تو بنجارے ہیں بنجارے..... ساری دھرتی کے نظارے کرتے ہیں تمھاری طرح پنجروں جیسے گھروں میں نہیں رہ سکتے۔ خود گڑوی وجاہ (بجا) کے کماتے کھاتے ہیں تیرے مٹھّو کی طرح نہیں ..... بہن کماتی ہے اور وہ شودا بس کھاتا ہے۔۔ ہمارے کھسم جُوروکی کمائی کھاتے ہیں یہ کمینہ بہن کی کمائی پر بیٹھا ہوا ہے۔'' بلّو نے گھر کی چابی چھادو کی ہتھیلی پر رکھی اپنی پوٹلی اُٹھائی اور بڑی شان سے اپنے پراندے کو گھماتے ہوئے گھر سے نکل گئی..... بلّو نے گھر سے باہر نکل کر ایک لمبی سانس بھری جیسے بلبل کو صیاد کے پنجرے سے رہائی ملی ہو۔

☆......☆......☆

چند دن کے بعد رانی اپنے بھائی کی برات لے کر بڑی شان سے پہنچی جھنگ

مٹھّو نے بھی بلّو کے جانے کے بعد رانی کو بالکل بھی نہیں کیا تھا تنگ

مٹھّو اپنی شادی کے موقع پر خوش تھا بہت

اُس کے ہاتھ آنے والی تھی حسن کی دولت

حلیمہ نے اپنے بیٹے کو فری کی خوبصورتی کے اتنے قصے تھے سنائے

مٹھّو نے فری کے ساتھ خوابوں میں سوئزرلینڈ میں بہت سے گیت تھے گائے

مٹھّو کی سج دھج تھی سب سے نرالی

رانی نے بڑی دھوم سے برات تھی نکالی

آخر کار آن پہنچی نکاح کی گھڑی

ساتھ ہی ایک آواز کانوں میں پڑی

''کُڑی نس گئی جے۔ (لڑکی بھاگ گئی ہے)''

''جس کا مجھے شک تھا وہی ہوا..... کڑی وی فل شریف ہی نکلی.....'' رانی نے افسردگی سے منہ میں کہا۔

یہ بات سُن کر سارے کے سارے ہجوم پر یک دم چھا گیا تھا سناٹا

فری نے جو جوتا، اپنے والدین کی عزت پر مارا اُس کا نام تھا باٹا

اب تو لکھنے کو بھی من نہیں چاہ رہا، قصہ کروں مختصر

فری کی اِس بے ہودہ حرکت سے جھک گئے سب کے سر
جھنگ سے خالی ہاتھ ہی برات شاہدرہ تھی لوٹی
مٹھّو کی وہٹی بن گئی کسی اور کی وہٹی
حلیمہ بیچاری تھی غم سے نڈھال
مٹھّو کا بھی تھا بُرا حال
رانی نے ایک بار پھر سے سارے گھر کو سنبھالا
اُس نے ہی اِس مشکل سے اپنی فیملی کو نکالا

☆......☆......☆

چند مہینوں بعد سب کچھ نارمل ہو گیا۔ سوائے مٹھّو کے۔ ہائے بیچارہ مٹھو۔ مٹھو پر بڑا ترس آتا ہے۔ اُس کی پہلی منگیتر مینا اگلے جہاں پرواز کر گئی۔ دوسری کے ساتھ رشتہ ہی نہیں جڑا۔

"اُس کا نام ہی بتا دو.....؟" سوری جی میں بشیراں اور مشتاق موٹے کی بیٹی کا نام نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ اب وہ کسی اور کی منگیتر ہے .....فری نے بھی مٹھو کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اُس کے گھر والوں کی فری پر کڑی نظر ہونے کے باوجود فری تو چڑی بن کر فُر سے اُڑ گئی۔ اب مٹھّو کو اُس کے دوست اکثر طعنے دیتے رہتے ہیں کہ اُس کی ہونے والی بیوی کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ ایک بات کی مجھے بھی آج تک سمجھ نہیں آئی بھاگتا کوئی ہے اور ہم الفاظ سے گھائل کسی اور کو کرتے رہتے ہیں.....

مٹھّو پہلے آوارہ تھا.....اب ہے دیوداس۔
مسٹر دیوداس والے سارے شوق مٹھّو نے اڈاپٹ کر لیے ہیں۔
آخر کار رانی نے مٹھّو کے لیے ایک اور لڑکی ڈھونڈ ہی نکالی۔ لڑکی کی بڑی بہن نے جیسے ہی پوچھا:
"لڑکا کیسا ہے.....؟"
حلیمہ نے بڑی ممتا بھری آواز میں جواب دیا:
"مُنڈا اَفّل شریف اَے....."

پانچ کا نوٹ

آج میں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے ہاتھ میں دس روپے کا سکہ دیکھا۔گزرے ہوئے وقت کا ایک دن یاد آ گیا۔ وقت ہم کو گزارتا ہے یا ہم وقت کو گزارتے ہیں؟ یہ سوال تو اپنی جگہ بہر حال رہے گا۔میں تو یہ جانتا ہوں ہر گزرتا دن بہت کچھ بدل جاتا ہے آپ کی ذات میں بھی اور کائنات میں بھی۔وقت سے زمانہ ہے اور زمانے سے وقت۔قدرت نے وقت کے ہر گزرتے لمحے میں بے شمار پیغام رکھے ہیں۔کسی کو وقت دلشاد کر جاتا ہے اور کسی کو برباد.....کوئی اپنی خصلت سے مجبور ہی رہتا ہے اور کوئی کوئی بدل بھی جاتا ہے۔
اسی طرح وہ پانچ کا نوٹ بھی میری زندگی میں بہت کچھ بدل گیا مثلاً میرے سوچنے کے زاویے اور میرے خیالات۔سالوں بعد آج بھی وہ نوٹ میں نے سنبھال رکھا ہے۔یہ بھی کمال ہے، کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ جانا۔اُس دن مجھے اِس بات کی سمجھ آئی کسی کو لاجواب کرنے کے لیے زبان سے جواب دینا ضروری نہیں ہوتا اور ایک ہم ہیں سارا دن عدالت میں دلیلیں دے دے کر ہلکان ہو جاتے ہیں اور جج کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی اِسی طرح ٹی وی ٹاک شوز دیکھتے ہوئے سیاسی قائدین کے چیلے چپاٹے اپنے قائد کی شان میں لمبے چوڑے قصیدے بیان کر رہے ہوتے ہیں وہ TV پر بیٹھ کر سینہ چوڑا کر کے کروڑوں لوگوں کے سامنے جھوٹ بول رہے ہوتے ہیں، نا جانے ہم کب سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ مانیں گیں.....؟
آج میں شہر کا بہت مشہور اور بڑا وکیل ہوں۔یہ قصہ اُن دنوں کا ہے جب کالج میں پڑھتا تھا۔میرے ایک دوست کی ٹانگ ٹوٹ گئی میں اُس کی تیمارداری کرنے جناح ہاسپٹل پہنچا۔حال احوال کے دوران وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔جب گھڑی پر نظر پڑی تو رات کے دس بج رہے تھے۔میں نے دوست سے اجازت لی اور ہاسپٹل سے نکل آیا۔دسمبر کا مہینا تھا سردی اتنی زیادہ تھی کہ دانت خود ہی حکومت اور اپوزیشن کی طرح ٹکرا رہے تھے۔میں اسٹیشن پر جانے کے لیے ویگن کے انتظار میں اسٹاپ پر کھڑا تھا چند منٹ بعد سردی کی وجہ سے میری ٹانگیں خود بہ خود تھرکنا شروع ہو گئیں۔پاس ہی ایک ڈھابا تھا وہاں پر چائے والے نے بلند آواز میں ملکہ ترنم نور جہاں کے پنجابی گانے لگا رکھے تھے اور خود چائے بنانے میں مصروف تھا۔"دسُن وے بلوری اکھ والیا.....آساں دل تیرے نال لالیا۔"میں چائے پینے کی غرض سے ڈھابے پر پہنچا۔چائے پینے کے بعد اپنی جیب سے اکلوتا سو کا پھُس پھُسا سا نوٹ نکالا، جو میلا بھی تھا اور پھٹا ہوا بھی۔
نوٹ پھٹ جائے تو کوئی بات نہیں، اُس کے اوپر قائد کی تصویر نہیں پھٹنی چاہیے۔جیسے ہی وہ نوٹ چائے والے کو دیا وہ اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا پھر میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے مجھے واپس کرتے ہوئے اشارہ کیا کہ یہ نوٹ نہیں چل سکتا۔وہ اپنے ڈیک کا والیم کم کرنے کے موڈ میں نہیں تھا اِس لیے اُس نے اشارے ہی سے کام چلایا۔میں نے بھی اُسے اشاروں ہی سے بتا دیا کہ میرے پاس یہی اکلوتا

نوٹ ہے لینا ہے تو لو نہیں تو تمھاری مرضی۔ چائے والا مسکرایا اور نوٹ تھام کر اندر جاتے ہوئے میری توجہ چولہے پر پکتی چائے کی طرف دلوائی کہ خیال رکھنا اُبل نہ جائے۔ تھوڑی 9 روپے [illegible] آیا اور مجھے دس دس کے نوٹ تھے۔ چائے تو نہیں اُبلی وہ نوٹ دیکھ کر میں ضرور اُبل گیا۔ اُن نوٹوں کے مقابلے میں میرا نوٹ صاف ستھرا تھا اور صحت مند بھی۔ وہ نوٹ ہو کر بھی شکل سے غریب اور مفلس ہی لگ رہے تھے۔ میں نے چپ چاپ وہ نوٹ اپنے کوٹ کی سامنے والی پاکٹ میں رکھ لیے اور ویگن سٹاپ کی طرف چل پڑا۔

ویگن آئی اُس میں بیٹھا چل پڑی اُس کا آخری سٹاپ لاہور کا ریلوے اسٹیشن تھا۔ کنڈکٹر پچاس پچپن کے لگ بھگ تھا جس نے اپنے بالوں کی سفیدی منہدی کی رنگت سے چھپائی ہوئی تھی۔ پان کھا کھا کر اُس کے دانت ڈارک براؤن ہو چکے تھے۔ صحت کے معاملے میں بھی اُس کا ہاتھ تنگ ہی تھا۔ اُس نے بے شمار پاکٹوں والی موٹی سی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اگر میں اُسے جیکٹ کے بغیر دیکھتا تو شاید اُس کی صحت دیکھ کر اُسے کوئی لقب دے دیتا۔ ویگن میں پہلے سے کوئی چھ سات لوگ ہوں گے جو اپنی سوچوں میں غرق تھے۔ ابھی تھوڑا سا سفر ہی طے کیا تھا کہ کنڈکٹر نے اپنے مخصوص انداز سے ہاتھ کا اشارہ کیا کدھر؟ میں نے بھی اُسے بتایا آخر تک، پھر اُس نے اپنے انگوٹھے اور انگوٹھے کی پڑوسن انگلی کی مدد سے نوٹ گننے کا اشارہ کیا۔ اُس کا مطلب تھا کرایہ دو۔ میں نے وہ 9 کے 9 غریب نوٹ اپنی جیب سے نکالے اور کنڈکٹر کے سامنے انہیں چیک کرنے لگا وہ کنڈکٹر مسلسل بڑی سنجیدگی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُن نوٹوں میں سے جو سب سے بری حالت میں تھا وہ نکال کر کنڈکٹر کے حوالے کیا۔ کنڈکٹر نے نوٹ تھاما تو اُس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اُس نے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور کچھ تلاش کرنے لگا۔ جب اُسے کچھ نہ ملا تو اُس نے میرا دیا ہوا نوٹ اپنے نوٹوں کے بیچ میں بڑی احتیاط سے رکھ دیا کہیں نوٹ کو کوئی نیا زخم نہ لگ جائے پھر اُس نے دوسری پاکٹ میں ہاتھ ڈالا اور چھوٹے بڑے نوٹوں کی دوسری گڈی نکالی اور اُس میں سے کچھ تلاش کرنے لگا اب میں مسلسل اُسے دیکھ رہا تھا مجھے چائے والا یاد آ گیا تھا۔ میں نے سوچا اب یہ کنڈکٹر بھی میرے ساتھ ویسا ہی کچھ کرنے والا ہے۔

کنڈکٹر نے وہ گڈی بھی واپس اُسی پاکٹ میں ڈال دی۔ وہ کچھ یاد کر رہا تھا اور جلد ہی اُسے یاد آ گیا۔ اُس نے اپنی جیکٹ کی دل کی جانب لگی ہوئی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کڑکتا، اُجلا، نیا نکور نوٹ نکال کر بڑے ادب سے مجھے ایسے پیش کیا جیسے کوئی غلام اپنے آقا کو کوئی تحفہ پیش کرتا ہے۔ اُس نے ایک لمحے میں اخلاق کی بلندی کو چھو لیا۔ اُس نے کچھ بھی نہیں کہا اور سب کچھ کہہ گیا۔ سارے راستے میرے اور اُس کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ آج بھی وہ غریب شکل وصورت کا بندہ میری نظر میں کسی شہنشاہ سے کم نہیں۔ کتنے ہی سال ہو گئے اِس بات کو آج تک اُس کا چہرہ مجھے نہیں بھولا۔ جب میں نے اُسے 10 کا نوٹ دیا اُس کے چہرے پر بڑی پیاری مسکراہٹ تھی اور جب میں نے اُس کے ہاتھ سے پانچ کا نوٹ تھاما تو میں شرم سے پانی پانی تھا۔ اُس کنڈکٹر نے مجھے کچھ نہ کہہ کے بھی اپنے اخلاق سے بہت کچھ سمجھا دیا۔ میں اُس نوٹ کو تحفہ سمجھتا ہوں اور وہ تحفہ میں نے آج بھی سنبھال کر رکھا ہے وہی: ''پانچ کا نوٹ''

❁ ❁

سوال.....؟

دُعا کے آگے سعید لکھوں یا سجاد؟ شادی سے پہلے میں دُعا سعید تھی اور شادی کے بعد دُعا سجاد بن گئی، پھر مجھ پر ایک قیامت گزری اور میں دُعا سے بد دُعا بن گئی۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں تھرڈ ائیر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ کینٹ سیالکوٹ سے ایک فیملی کا رشتہ آیا، لڑکے والے ابراہیم بھائی کے جاننے والے تھے۔ ابراہیم بھائی میرے بڑے اور اکلوتے بہنوئی ہیں۔ حیا آپی کو بھی وہ رشتہ بہت پسند آیا۔ آناً فاناً میری شادی ہوگئی۔ شادی کے وقت میری عمر تقریباً 18 سال تھی۔ شادی کی پہلی رات میں نے سجاد سلطان کو دیکھا اُس سے پہلے امّی نے سجاد کی ایک تصویر دکھائی تھی۔ وہ اپنی تصویر سے کہیں زیادہ خوبصورت اور ہینڈسم تھا۔ میری اور سجاد کی عمر میں سات آٹھ سال کا ڈیفرنس تھا۔ شادی کے چند دنوں بعد ہی میں اور سجاد ہنی مون کے لیے یورپ چلے گئے۔ سجاد کے والد انکل سلطان سیالکوٹ کے جانے مانے ایکسپورٹر تھے، سجاد کے گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی میں بھی دولت کی اُس چمک میں کھوگئی شادی کے دو ماہ بعد ہی اللہ نے کرم کردیا۔ میری گود بھرائی کی رسم بھی بڑی دھوم دھام سے انجام پائی۔ حیا آپی نے بھی میری گود بھرائی کی رسم میں شرکت کی، اُس کے بعد وہ بھی ابراہیم بھائی کے پاس واپس پیرس چلی گئی اُن کے بچوں کی چھٹیاں ختم ہوگئیں تھیں۔

میری شادی کے بعد امّی اور راشد اکیلے رہ گئے تھے۔ راشد کالج میں چلا گیا تھا۔ میں ہر روز امّی کو ٹیلی فون کرتی اور ہفتے میں ایک چکر اُن کی طرف ضرور لگاتی کینٹ سے اڈا پسروریاں دُور ہی کتنا تھا، کبھی سجاد اپنی فیکٹری جاتے ہوئے مجھے امّی کی طرف ڈراپ کردیتے اور شام کو فیکٹری سے واپسی پر پک کرلیتے۔ میرا ساتواں مہینا شروع ہوگیا تھا۔ ایک رات میں نے سجاد کو ٹیلی فون پر کسی سے باتیں کرتے ہوئے سُنا مجھے شک ہوا۔ چند دن بعد میں نے حوصلہ کر کے سجاد سے پوچھ ہی لیا۔ تو اُس نے بغیر کسی جھجک اور شرم کے مجھے صاف صاف بتا دیا کہ اُس کا ایک شادی شدہ عورت سے چکر ہے اُس کے دو بچے بھی ہیں۔ اُس کا میاں بھی ایکسپورٹر ہے اور اکثر ملک سے باہر ہوتا ہے اُس کی غیر موجودگی میں سجاد اُس عورت کی تنہائی دُور کرتا ہے۔ میں نے کئی بار سجاد کو سمجھانے کی کوشش کی مگر کوئی رزلٹ نہیں نکلا۔ ایک رات بات اتنی بڑی کہ سجاد کا مجھ پر ہاتھ اُٹھ گیا پھر یہ اکثر ہونے لگا میری زبان چلتی اور اُس کا ہاتھ، میں کس سے اِس کا ذکر کرتی، اپنی ساس سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن نہیں کرسکی۔

پھر اللہ نے مجھے خوشی دکھا دی۔ ارسلان کی پیدائش کی خوشی میں انکل سلطان نے ایک دعوت کی جس میں میرے میکے اور

سسرالیوں کے تمام رشتے دار مدعو تھے۔ مجھے لگا یہ مناسب وقت ہے میں نے سجاد اور اُس عورت کی ساری کہانی سب رشتے داروں کو سُنا دی اور سجاد کو سمجھانے کی درخواست بھی کی۔ سجاد کو جب یہ پتا چلا تو وہ کہنے لگا:

''تم نے مجھے سب رشتے داروں میں بدنام کیا ہے۔ تم مجھ سے بات کرتی، رشتے داروں کے سامنے تماشا لگانے کی کیا ضرورت تھی۔'' بحث شروع ہوگئی، بحث تلخ کلامی میں کب بدلی پتا ہی نہیں چلا۔ تلخ کلامی نے لڑائی کی شکل اختیار کر لی میرا بھائی راشد بھی جذباتی ہوگیا۔ سجاد کے گھر والوں نے ارسلان کو مجھ سے چھینا، سجاد نے اُسی وقت مجھے کئی طلاقیں دے ڈالیں، مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا، لمحوں میں میری دنیا برباد ہوگئی، اُسی وقت مجھے میرے رشتے داروں سمیت گھر سے نکال دیا گیا۔

میں روتی دھوتی وہاں سے اپنے گھر پہنچی۔ ایک ارسلان کی جدائی کا غم اوپر سے طلاق کا طوق میرے گلے میں..... دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں، مہینوں نے سالوں کا روپ دھار لیا چار سال کیسے گزرے پتا ہی نہیں چلا۔ اُن چار سالوں میں سجاد کے گھر والوں نے کبھی مجھ سے رابطہ نہیں کیا اور نہ ہی میں نے کوشش کی کہ اپنے بیٹے کا ہی پتا کر لوں یا اُسے دیکھ ہی آؤں۔ امی اور حیا آپی نے شروع ہی میں کہہ دیا تھا:

''اپنا بیٹا مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم نے اِس سلسلے میں عدالت سے رجوع کیا تو سمجھنا تمھاری ماں اور بہن مر گئیں تمھارے لیے.....'' میں امی اور آپی کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ امی اور آپی میری دوسری شادی کروانا چاہتی تھیں۔ میرے کئی رشتے آئے مگر بات نہیں بن سکی۔

ایک دن خبر ملی کہ سجاد کو اُس عورت کے رشتے داروں نے ڈنڈے مار مار کے گلی میں پھینک دیا ہے۔ سجاد کے گھر والے لاش اُٹھا لائے۔ سجاد کی موت کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی یہ حادثہ رات دس بجے کے قریب ہوا تھا اگلے دن صبح 11 بجے سجاد کا جنازہ تھا قبر کھود لی گئی تھی۔ سجاد کے ایک انکل ڈاکٹر ہیں۔ جنازہ اُٹھانے سے پہلے انہیں سجاد کے جسم میں حرارت محسوس ہوئی وہ سب سے لڑ جھگڑ کر سجاد کو ہسپتال لے گئے۔ وہاں انہوں نے سجاد کو کوئی مہنگا انجکشن لگایا۔ سجاد کے جسم میں جان باقی تھی۔ سجاد اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے نہیں پتا یہ کرامت تھی یا کچھ اور سارا شہر سجاد کو دیکھنے اُمڈ آیا۔ میرے محلے کی عورتوں نے مجھے بھی مجبور کیا کہ تم بھی چلو میں بھی پردہ کر کے اُن کے ساتھ چلی گئی۔ بڑے سے لان میں سجاد ایک اسٹیج پر بیٹھا ہوا تھا اور لوگ اُس کی زیارت کر رہے تھے۔ سب لوگوں کو مٹھائی اور چائے پیش کی جا رہی تھی۔

''یہ ہے وہ نوجوان جو موت کی دہلیز پر کھڑا رہا اور دنیا سے عالمِ برزخ میں نہیں گیا۔'' ایک ملنگ نے زور سے سجاد کی طرف انگلی کر کے کہا۔ سجاد کی ممّی نے سجاد پر سے چند ہزار وار کر اُس ملنگ کو دیے۔ گھر کی ایک ملازمہ اُسی وقت میرے بیٹے ارسلان کو بھی وہاں لے آئی۔ میری ساس نے ارسلان کو چوما اور کہنے لگی! ''یا اللہ تیرا شکر ہے جو تو نے میرے پوتے ارسلان پر اُس کے باپ کا سایہ رہنے دیا۔'' میں نے سُنا تو میرے اندر کی ممتا جاگ اُٹھی۔ میں ارسلان کی طرف لپکی تو میری چادر گر گئی اور میرے چہرے سے نقاب ہٹ گیا۔ میں نے

جاتے ہی اپنی ساس سے ارسلان کو لے لیا اور اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ارسلان کو سینے سے لگاتے ہی مجھے سکون مل گیا۔ سارا ہجوم حیران اور پریشان تھا۔

سجاد اپنی کرسی سے اُٹھا اور ہجوم کو مخاطب کر کے کہنے لگا:

''یہ میری بیوی ہے ناراض ہو کر میکے چلی گئی تھی۔'' ہماری آنکھیں چار ہوئیں پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا میں کہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکی۔ میں سجاد کے پاس ہی رُک گئی۔ محلے کی عورتوں نے گھر جا کر امّی کو اطلاع دی چند گھنٹے بعد امّی اور بھائی مجھے لینے آئے تب تک سجاد شہر کے ایک بڑے عالم کا فتویٰ لے آیا تھا۔ امّی نے میری مرضی پوچھی۔ میں محبت کی تپش سے پگل گئی تھی۔ وہ محبت ارسلان کی تھی یا پھر سجاد کی مجھے نہیں پتا۔ ''تمھاری طلاق ہو چکی ہے۔'' امی نے مجھے سمجھایا۔ یہ سُن کر سجاد کہنے لگا:

''میرے پاس بڑے عالمِ دین کا فتویٰ ہے ہماری طلاق نہیں ہوئی۔ یہ اب بھی میری بیوی ہے۔ میں اِسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں اُس دِن جو ہوا میں آپ سب سے اُس کی معافی مانگتا ہوں۔'' سجاد کی آنکھوں میں نمی تھی وہ یہ ریلیشن رکھنا چاہتا تھا۔ میں وہیں رُک گئی میں چار ماہ سجاد کے ساتھ بیوی کی طرح رہی مگر بے چین، ہر گزرتے دن کے ساتھ میری بے چینی میں اضافہ ہوتا رہا پھر مجھے خوف ناک خواب آنے لگے کہ میں جہنم کی آگ میں جل رہی ہوں۔ چار ماہ بعد میں پھر سے امی کے گھر آ گئی۔ سجاد کئی بار مجھے لینے آیا مگر میں نے جانے سے انکار کر دیا۔ ایک دن تنگ آ کر سجاد مجھے کہنے لگا:

''اِس بار تو میں نے تمھیں پھولوں کی طرح رکھا ہے اور اب میرے کسی دوسری عورت کے ساتھ تعلقات بھی نہیں ہیں۔'' بات تو سجاد کی صحیح تھی مگر میں اُس کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی۔ سجاد کی قربت مجھے کسی گناہ کا احساس دلاتی تھی۔ میں بیمار رہنے لگی امّی نے کئی ڈاکٹروں سے دوائی لی مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ امّی کو کسی نے ایک حکیم صاحب کا بتایا۔ حکیم صاحب نے دو بار مجھے ہفتے ہفتے کی دوائی دی۔ تیسرے ہفتے حکیم صاحب کہنے لگے ''بیٹی تمھیں بیماری تو کوئی نہیں کوئی دُکھ کوئی پچھتاوا ہے۔'' حکیم صاحب شہر کے جانے مانے حکیم تھے انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھا میں نے اپنی ساری کہانی اُنہیں سُنا دی۔

''بیٹی تم چار ماہ تک اُس شخص کے ساتھ ناجائز طور پر رہی ہو۔''

''مگر سجاد کے پاس کسی عالمِ دین کا فتویٰ تھا۔''

''تو پھر واپس چلی جاؤ۔'' حکیم صاحب نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اُس کی قربت مجھے کسی گناہ کا احساس دلاتی ہے۔'' حکیم صاحب میری بات سُن کر سوچ میں پڑ گئے۔ تھوڑی دیر خاموش رہے پھر کہنے لگے:

''نیکی کرنے کے بعد سکون ملتا ہے اور گناہ کرنے کے بعد پچھتاوا ہوتا ہے۔ اگر گناہ مسلسل کرتے رہو پھر پچھتاوا ہونا بھی ختم ہو

جاتا ہے۔میرے عقیدے کے مطابق تمھاری طلاق ساڑھے چار سال پہلے ہی ہو چکی تھی ۔ دیکھو بیٹی! یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ میں تمہیں کوئی فتویٰ تو جاری نہیں کروں گا۔ اپنا نقطہ نظر میں نے تمھارے سامنے رکھ دیا ہے باقی شہر علما کرام سے بھرا پڑا ہے تم کسی اور سے پوچھ لو۔'' حکیم صاحب نے بڑی شائستگی سے اپنی رائے میرے سامنے رکھ دی تھی، میں وہاں سے آ گئی۔ اگلے چند دن میں نے شہر کے تمام بڑے علما کرام سے فتوے لیے آدھے کہتے ہیں: ''ساڑھے چار سال پہلے تمھاری طلاق ہو گئی تھی۔''

آدھے کہتے ہیں: ''تمھیں طلاق نہیں ہوئی۔''

میں پریشان ہوں میں اپنے بیٹے کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی میں کیا کروں آپ ہی مجھے بتائیں؟

''میں کس کی مانوں..... یہ ہے میرا سوال؟''

شکیل احمد چوہان کی آنے والی کتابیں

1- م سے محبت (ناول) (اکتوبر 2017ء)

2- دل درِ بدر (ناول) (فروری 2018ء)۔

ختم شد